جلد (۲) عدد (۴) ۶ ۸ ، ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۲ ہجری

ترجمان القرآن

مجلس تحریک قرآن کا ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ صمہ ۔ بیرون ہند کے لئے (ہے) قیمت فی پرچہ ۸ر

خـــالی صفحـــه

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ایک وقت تھا کہ مسلمان تمام دنیا کے لئے نمونہ تھے دنیا کی دوسری قومیں ان کی مثال سے سبق لیتی تھیں ان کی سعی و عمل سے سارا جہان ہدایت و رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ ان کے نزدیک کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ کا فخر محض مسلمان ہونے کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی امتیازی خصوصیت بھی اس کی ایک جز تھی۔ وہ دنیا میں اسی لئے تھے کہ وہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے تھے کل نوع بشر کے واسطے نمونہ بننے کے لئے تھے۔

لیکن آج وہ وقت آیا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے نمونہ بن گئی ہیں۔ ان کی سعی و عمل ہمارے لئے سبق آموز بن گئی ہے۔ وہ ہدایت و رہنمائی کے منصب پر قابض ہیں، اور ہم اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں کہ ہمارے سامنے ان کا رنامے مثال کے طور پر پیش کئے جائیں، اور ہم ان سے درس حاصل کریں۔

گو مسلمان قوم کے لئے اس سے زیادہ شرمناک کوئی بات نہیں کہ دوسروں کی مثالیں اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ مگر ہم اس کو پیش کریں گے اور اسی لئے پیش کریں گے کہ یہ شرمناک ہے۔ شاید کہ اسی طرح اس قوم کو کچھ شرم آئے اور یہی شرم اس کے لئے محرک عمل بن جائے۔

آج ہم ان کارناموں کو بیان کرنا چاہتے ہیں جو بائبل کی تعلیم کو دنیا میں پھیلانے کے لئے مسیحی دنیا کی متعدد جماعتوں میں سے صرف ایک جماعت برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی (British and Foreign Bible Society) نے انجام دیے ہیں

یہ جماعت ۱۸۰۴ء میں قائم ہوئی۔ اور پورے ۱۲۹ سال سے بائبل کے تراجم ربع مسکون کے ہر ہر گوشے

تک پہنچانے اور نوع بشر کے ہر فرد کو اس کی تعلیم سے آگاہ کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ اس کے کام نے جس رفتار کے ساتھ ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۸۰۸ء میں اس نے بائبل کے صرف ۸۱۱۵۷ نسخے شائع کئے تھے۔ ۵۰ سال کے اندر یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ۱۶۰۲۱۸۷ تک پہنچ گئی۔ ایک صدی کی مسلسل کوششوں نے اس تعداد کو ۵۶۸۸۳۸۱ تک پہنچایا۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں یہ تعداد ایک کروڑ سے متجاوز ہو گئی، سنہ ۱۹۳۰ء میں سوا کروڑ کے قریب پہنچی، اور سنہ ۱۹۳۲ء میں دنیا کی شدید معاشی ابتری اور عام پریشانی کے باوجود اس جماعت نے بائبل کے ۱۰۵۵۲۲۸۱ نسخے شائع کئے۔

مجموعی طور پر سنہ ۱۸۰۸ سے لیکر سنہ ۱۹۳۲ء تک ۱۲۴ سال کی مدت میں اس نے بائبل کے جتنے نسخے شائع کئے ہیں ان کی تعداد ۴۳۱۸۵۳۵۹۷ ہے، اور بجا طور پر اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس مدت میں دنیا کی کوئی کتاب اتنی تعداد میں شائع نہیں ہوئی ہے۔

اس وقت تک بائبل یا اس کے مختلف حصوں کا ترجمہ دنیا کی ۶۵۵ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ممالک کے لحاظ سے ان کی تقسیم حسب ذیل ہے:-

یورپ کی	۹۰	زبانیں
افریقہ کی	۲۲۹	″
ایشیا کی باستثناء ہندوستان	۸۶	″
ہندوستان کی	۱۱۲	″
امریکہ کی	۴۶	″
اوشیانا (آسٹریلیا و نیوزی لینڈ وغیرہ کی)	۹۲	″

اس تعداد میں جس تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی اس کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء میں

بائبل سوسائٹی کی فہرست پر ۴۱۲ زبانیں تھیں۔ ۴۳ ۲ سال کے اندر ۴۴ ۲ زبانوں کا اضافہ ہوا۔ گویا اوسطاً ہر سال ۱۰ انئی زبانوں میں بائبل یا اس کے مختلف حصوں کے ترجمے کئے گئے۔

بعض علاقوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر بائبل سوسائٹی نے ایسے ایڈیشن بھی شائع کئے ہیں جن میں دو دو اور تین تین اور چار چار زبانیں استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً دولسانی ایڈیشن ۱۱۱ ہیں۔ ایک ایڈیشن سہ لسانی ہے جس میں یونانی، فارسی اور اردو ترجمے ایک ساتھ دیئے گئے ہیں۔ اور ایک ایڈیشن چہار لسانی ہے جس میں انگریزی، گجراتی، مرہٹی اور اردو زبانیں استعمال کی گئی ہیں۔ ---

پھر اندھوں کے لئے اس نے دنیا کی چالیس زبانوں میں الگ ایڈیشن شائع کئے ہیں جن میں خاص ابھرے ہوئے حروف استعمال کئے گئے ہیں۔ ان میں اردو، ہندی، بنگالی، تلنگی، مرہٹی اور ٹامیل زبانیں بھی شامل ہیں اور ہماری مقدس دینی زبان عربی بھی ہے جس میں آج تک اندھوں کے لئے قرآن مجید کا کوئی الگ نسخہ شائع کرنے کی توفیق ہمیں نصیب نہیں ہوئی ہے۔

ممالک اسلامیہ اور ہندوستان میں جس کثرت کے ساتھ اس جماعت نے بائبل کے تراجم پھیلائے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھیے کہ ۱۲۴ سال کے اندر ہندوستان اور دنیائے اسلام کی خاص خاص زبانوں میں بائبل کے کتنے نسخے شائع ہوئے ہیں۔

عربی	۲۶۸۴۲۲۲
فارسی	۷۲۲۰۴۶
اردو	۵۶۶۷۸۴۸
پشتو	۱۰۲۲۶۱

پنجابی	۸۵۲۶۱۰
سندھی	۱۸۸۲۵۸
بلوچی	۲۱۰۰۰
بنگالی	۴۶۱۹۹۴۴
ہندی	۷۴۸۷۷۲۶
مرہٹی	۳۵۰۴۲۸۵
تلنگی	۴۲۰۸۱۹۷
کنٹری	۱۳۶۵۳۹۱
ملایالم	۲۲۹۹۵۹۵

تراجم کی محض تعداد سے اس محنت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اس کام میں صرف کی گئی ہے دنیا کی بہت سی ایسی زبانوں میں جن کی نہ کوئی صرف و نحو مدون تھی۔ نہ لغت مرتب کی گئی تھی، اور جن میں کوئی رسم الخط تک موجود نہ تھا۔ بائبل کا ترجمہ کرنے اور اس کو شایع کرنے میں مسیحی پادریوں کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان کا تصور بھی ہم نہیں کر سکتے۔ ایک دو نہیں ایسی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں کہ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے، جو تہذیب و تمدن کی آغوش میں پلے اور بڑھے تھے، سالہا سال دور دراز کے غیر متمدن علاقوں میں جا کر زندگی بسر کی، انکی زبان سیکھی، ان کے قواعد صرف و نحو مدوّن کیے، ان کی لغات مرتب کیں، ان کے رسم الخط مہذب کیے، ان کے لیے ٹائپ ایجاد کئے، ان کے باشندوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا، اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا کہ ان زبانوں میں بائبل کا ترجمہ شائع ہو سکے، اور وہاں کے باشندے اس ترجمے سے فائدہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں جس جفاکشی، ایثار، اور دین پرستی کا اظہار مسیحی پادریوں نے کیا ہے، اس کی نظیر ہم کو موجودہ دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔

ایک نظر اس جماعت کے طریق کار پر بھی ڈال لیجئے۔ اس کی حکمران مجلس جس کا صدر دفتر لندن میں ہے، ۳۶ ارکان پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۱۵ کلیسائے انگلستان کے پیرو ہیں، ۱۵ دوسرے عیسائی فرقوں کے نمائندے ہیں، اور ۶ بیرونی ممالک کی عیسائی آبادی کے نمائندے۔ اسی مجلس کے تحت تمام دنیا میں بائبل سوسائٹی کا کام چل رہا ہے اشاعت کے کام کی تنظیم اس طرح کی گئی ہے کہ دنیا کو ۵ حلقوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر حلقے کا انتظام ایک معتمد کے سپرد ہے، اور ہر معتمد کے ماتحت بڑے بڑے مرکزی مقامات پر مہتمم یا نائب معتمد رہتے ہیں۔ یہ مہتمم اور نائب معتمد اپنے اپنے علاقوں میں سوسائٹی کی شاخیں، معاون جماعتیں (Auxiliaries) اور بائبل کی فروخت کے لئے ڈپو قائم کرتے ہیں، اور گشت کرنے والے گماشتے (Colporteurs) مقرر کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء کی رپوٹ کے مطابق اس زبردست نظام کے تحت دنیا میں دس ہزار سے زیادہ شاخیں اور معاون جماعتیں کام کررہی ہیں، ۳۵۰ ڈپو قائم ہیں۔ اور ایک ہزار سے زیادہ گماشتے مستقل طور پر اس غرض کے لئے مقرر ہیں۔ کہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھر کر بائبل فروخت کریں۔ جہاں تک ممالک اسلامیہ اور ہندوستان کا تعلق ہے، ہم اس نظام اور اس کے کام کی تھوڑی سی تفصیل یہاں درج کرتے ہیں۔

حلقۂ مصر: یہ حلقہ مصر، سوڈان، فلسطین، شام، شرق اردن، قبرس، عرب، مصوع، اور حبش پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۴ ڈپو قائم ہیں، اور ۳۳ گماشتے سفر کرتے رہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں بائبل کے ۹۶،۴۸۰ نسخے ۶۵ زبانوں میں فروخت ہوئے جو سنہ ۱۹۳۰ء کی بہ نسبت تعداد ۲۴ ہزار زیادہ ہیں۔ پورٹ سعید اور اسکندریہ کے بندرگاہوں میں سوسائٹی کے گماشتے مستقل طور پر مقرر ہیں اور وہ ہر آنے جانے والے جہاز پر پہنچ کر بائبل فروخت کرتے رہتے ہیں۔ شام میں اقتصادی حالت کی شدید خرابی کے باوجود تقریباً ۲۵ ہزار نسخے بیچے گئے اور اکثر دیہات میں انڈوں اور روٹیوں کے عوض بائبل فروخت کی گئی۔ اس حلقے میں ایک ملک عرب بھی ہے جہاں بائبل کسی طرح نہیں پہنچ سکتی۔

مگر اس سد سدید میں عدن کا رخنہ پیدا کر لیا گیا ہے! اور اس راستہ سے سنہ ۱۹۳۱ء میں ۱۴۹ نسخے سنہ ۱۹۳۰ء میں ۵۲۰ نسخے اور سنہ ۱۹۲۹ء میں ۲۳۵ نسخے عرب میں داخل کئے گئے ہیں۔

شمالی افریقہ: اس حلقہ میں الجزائر، تونس، مراقش اور طرابلس شامل ہیں۔ ۲ ڈپو اور ۶ گماشتے کام کر رہے ہیں جن کے ذریعہ سے سنہ ۱۹۳۱ء میں ۶۹۲۱۷ نسخے ۴۱ زبانوں میں فروخت ہوئے۔ یہ تعداد سنہ ۱۹۲۵ء کے مقابلہ میں ۱۳ ہزار کم ہے۔ اس علاقہ کے اور خصوصاً الجزائر کے مسلمان نہایت سخت واقع ہوئے ہیں، اور ان کو بائیبل کا خریدار بنانا حد درجہ مشکل ہے۔ اگرچہ وہ سوسائٹی کے گماشتوں سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں، اور ہر معاملہ میں خوش اخلاق ہیں مگر جہاں بائیبل کا سوال درمیان میں آیا اور انہوں نے صاف جواب دیدیا کہ "ہم کو ان کتابوں کی ضرورت نہیں ہے ہمارے علاقہ میں تم کو اپنی کتابوں کا کوئی خریدار نہ ملیگا"۔ تاہم اس شدید مقاومت کے باوجود سوسائٹی کے گماشتے اپنا کام کئے جا رہے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ایک وقت میں کامیابی کے دروازے کھل کر رہیں گے۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی رپورٹ میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:-

> "زمانۂ مابعد میں جب مسیحی مبلغین اس قابل ہو جائیں گے کہ اسلامی عصبیت کے ان دور دراز اور سر دست مخالف قلعوں میں پہنچ سکیں تو وہ دیکھیں گے کہ کتاب مقدس نے پہلے سے وہاں پہنچ کر دین مسیح کی بنیادیں رکھدی ہیں اُس دین کی بنیادیں جسے آیندہ کبھی مسلمانوں کے حملے پامال نہ کر سکیں گے۔"

حلقۂ ایران:- اس حلقہ میں ایران، عراق اور خلیج فارس کے سواحل شامل ہیں۔ ۲۳ ڈپو اور ۵ گماشتے کام کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۵۹۳۴۷ نسخے ۲۴ زبانوں میں فروخت ہوئے جو سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلہ میں تقریباً ۴ ہزار زیادہ ہیں۔ گماشتوں کے کام کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ۵۹ ہزار میں سے ۵۱ ہزار نسخے

انہی لوگوں کے ذریعہ سے فروخت ہوئے ہیں۔ باوجودیکہ حکومت ایران کی طرف سے سلطنت اور دین اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی سخت ممانعت ہے، مگر سوسائٹی کا کام تیزی سے بڑھ رہا ہے اور سلطنت ایران کے حدود میں ۴۰ ہزار نسخے بائ[illegible] نسخے ایک سال کے اندر فروخت ہوئے ہیں۔ الجزائر کی طرح عراق کے بدوی علاقوں میں بھی عوام کی مزاحمت شدید ہے لیکن اس کے باوجود مسیحی مبلغین وہاں ایک سال کے اندر خاص مسلمانوں کے ہاتھ بائبل کے ۹۰۴ نسخے فروخت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حلقہ ہند: [illegible] یہ حلقہ کلکتہ، مدراس، بمبئی، بنگلور، الہ آباد، اور لاہور کی ایجنسیوں پر مشتمل ہے۔ ۱۸ ڈپو قائم ہیں، اور ۸۰ گماشتے کام کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۹۱۹۹۳۱ نسخے فروخت ہوئے جو سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلہ میں بقدر ایک لاکھ کم ہیں۔ یہاں صرف مرد گماشتے ہی مقرر نہیں ہیں بلکہ عورتیں بھی گھر گھر پھر کر بائبل فروخت کرتی پھرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بائبل سوسائٹی ہر اس طالب علم کو جو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کرے، نیا عہد نامہ مفت نذر کرتی ہے، اور جو بی اے کی سند حاصل کرے اسے پوری بائبل بلا قیمت دیتی ہے، بشرطیکہ وہ اس کی درخواست کرے۔

حلقہ ملایا: اس حلقہ میں جزیرہ نمائے ملایا، بورنیو، سماٹرا، جاوا، ملکا وغیرہ علاقے شامل ہیں۔ ۵ ڈپو اور ۸۰ گماشتے کام کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۲۲۳۶۰۶ نسخے ۲۱ زبانوں میں شائع کئے گئے۔

حلقہ چین: اس حلقے کو ۱۳ ایجنسیوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے ماتحت ۲۲ ڈپو قائم ہیں، اور ۴۵۴ گماشتے کام کر رہے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ۴۵۰۶۴۱۵ نسخے شائع کئے گئے جو سنہ ۱۹۲۹ء کے مقابلہ میں بقدر ۸ لاکھ کم ہیں۔ اس کے علاوہ امریکن بائبل سوسائٹی نے اس سال ۲۰ لاکھ نسخے اور اسکاٹ لینڈ کی نیشنل سوسائٹی نے ۲۳ لاکھ نسخے چین میں شائع کئے۔ اس طرح اس ملک میں صرف ایک سال کے اندر بائبل کے ۱۰۸۱۳۷۱ نسخے شائع ہوئے ہیں۔

اس داستان کو ختم کرنے سے پہلے یہ بھی سن لیجئے کہ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء کے مالی سال میں اس سوسائٹی کے آمد و خرچ کا کیا حال رہا ہے؟

آمد: چندوں عطیوں اور دوسری خیراتی مدات سے	۲۲۸۰۳۰ پونڈ
کتابوں کی فروخت سے	۱۴۲۶۶۲ ″
کل	۳۷۰۶۹۲ ″
خرچ: تراجم اور طباعت کتب میں	۲۰۷۶۸۶ ″
کارکنوں کی تنخواہیں اور دوسرے مصارف	۱۶۳۶۴۳ ″
کل	۳۷۱۳۲۹ ″

یوں سمجھئے کہ اس سوسائٹی کی آمدنی اور اس کا خرچ ۵۰ لاکھ روپئے سالانہ کے لگ بھگ ہے اور وہ ہندوستان کی ایک اچھی خاصی متوسط درجہ کی ریاست سے برابری کا دعویٰ کرسکتی ہے۔

پھر اس کے اعتماد اور اس کی وقعت کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ اس کے صدر انگلستان کے خاندان شاہی کے ایک ممتاز رکن ڈیوک آف کناٹ ہیں۔ اور اس کے نائبان صدر کی فہرست میں ہم کو مارکوئس آف ابرڈین، ڈیوک آف ڈیون شائر، وائی کاونٹ سیسل، لارڈ مسٹن، مسٹر بالڈون، ارل آف کلیرنڈن، مارکوئس آف سالیسبری، لارڈ ولنگڈن، لارڈ اروِن، اور لارڈ سینکے جیسے لوگوں کے نام ملتے ہیں۔

یہ تو اس قوم کے مذہبی شغف اور جذبۂ خدمت دین کا حال ہے جس کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ وہ مذہب کو چھوڑ چکی ہے اور خدا کی حکومت اس کے حدود سلطنت سے خارج کی جا چکی ہے۔ اب ذرا اس قوم کی حالت پر نظر ڈالئے جسے مذہبیت اور دین داری کا بڑا دعویٰ ہے۔ کیا اس نے بھی قرآن مجید کی خدمت اسی قدر نہ سہی اس کا ہزارواں حصہ ہی انجام دی ہے؟ کیا اس نے بھی اللہ کے آخری پیغام کو اس کے ناواقف بندوں تک پہنچانے کے لئے کوئی قابل ذکر کوشش کی ہے؟ کیا اس نے بھی ہندستان میں نہ سہی اپنے قرب وجوار ہی میں بسنے والی غیر مسلم قوموں کو

قرآن مجید کی تعلیم سے باخبر کرنے کے لئے کسی عملی سرگرمی کا اظہار کیا ہے؟ اور غیر مسلموں کو جانے دیجئے، کیا اس نے خود مسلمانوں ہی کے پسماندہ طبقات میں قرآن کا علم پھیلانے کے لئے کسی قسم کی عملی جدوجہد کی ہے؟ اس کے جواب میں اگر ہم اپنے نامۂ اعمال پر ایک نگاہ ڈالیں گے تو وہ ہمکو ایک ورق سادہ نظر آئے گا۔ اور ہمیں شرم سے اپنا سر جھکا لینا پڑیگا

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید شایع ہوتا ہے، اور بکثرت شائع ہوتا ہے مگر کس طرح؟ جو بدتر سے بدتر کاغذ بازار میں مل سکتا ہے، جو بدتر سے بدتر کتابت ہمارے ملک میں ممکن ہے، جو بدتر سے بدتر طباعت ہمارے مطابع میں ہو سکتی ہے، جو بدنما سے بدنما جلد جاہل جلد سازی کے کارخانوں میں بن سکتی ہے، وہ دنیا کی اس بہترین کتاب کے لئے وقف کردی گئی ہے۔ اسے صحت کے ساتھ چھاپنے اور اغلاط کتابت سے محفوظ رکھنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی اس کے بیشتر شائع کرنے والے لوگ وہ ہیں جن کے پیش نظر بجز مالی منفعت کے اور کچھ نہیں ہے اس لئے وہ کم سے کم روپیہ اور محنت صرف کرکے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو، فارسی اور شاید دو چار اور زبانوں کے سوا دنیا کی کسی زبان میں اس کا صحیح اور قابل اطمینان ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اور جن زبانوں میں ہو چکا ہے، اس کو بھی تبلیغی اصول پر شائع کرنے اور اجتماعی کوشش کے ساتھ عامۃ الناس تک پہنچانے کے لئے اب تک کچھ نہیں کیا گیا ہے جس قیمت میں بائبل کے کم از کم پانچ بہترین نسخے بہم پہنچ سکتے ہیں۔ اس میں قرآن مجید کے ترجمے کا ایک اچھا نسخہ ملتا ہے، اور وہ بھی اپنے محاسن صوری کے اعتبار سے بائبل کا ہم پلہ نہیں ہوتا۔ قرآن مجید اور اس کے تراجم کی اشاعت خود پڑھنے والوں کے ذاتی شوق پر منحصر ہے کوئی گروہ ہم میں ایسا موجود نہیں ہے جو وسیع پیمانے پر اس کے مطالعہ کا شوق لوگوں میں پیدا کرے اور ان لوگوں تک اسے پہنچائے جو سب سے زیادہ اس کی ہدایت کے محتاج ہیں اور دنیا کی پریشان حال آبادی کو بتائے کہ جس آب حیات اور جس نور حق اور جس قانون امن کی اس کو ضرورت ہے، وہ یہی قرآن ہے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا مقصد بس اسی قدر نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے ناظرین میں غیرت

دینی کی ایک لہر پیدا ہو، اور جہاں بہت سی ایسی لہریں ناپید ہو چکی ہیں، وہیں یہ لہر بھی ناپید ہو جائے۔ درحقیقت ہماری غرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی علمی خدمت کے لئے دعوت دیں۔ قرآن مجید کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنے اور ان کو کثرت کے ساتھ پھیلانے کے لئے ایک مرکزی ادارہ حیدرآباد میں قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اور متعدد ارباب فضل اس کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرنے کی جدوجہد میں مشغول ہیں لیکن قبل اس کے کہ اس ادارے کے قیام کا اعلان ہو، ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کتنے مسلمان عملاً اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے طیار ہیں، تاکہ ہم اندازہ کرسکیں کہ ہمیں اپنی قوم سے کم از کم کتنی ہمدردی اور کتنی اعانت کی امید رکھنی چاہئے۔ اعانت کے معنی لازماً مالی اعانت ہی کے نہیں ہیں، بلکہ ہر مسلمان اپنی جگہ ہاتھ سے پاؤں سے، دماغ اور دل سے، قلم اور زبان سے، اور حتی الوسع اپنے روپیہ سے قرآن مجید کی خدمت میں حصہ لے سکتا ہے۔ یہ تو جماعت کی تشکیل مکمل ہونے کے بعد بتایا جائیگا کہ کون کس طرح اس خدمت میں شریک ہو سکتا ہے۔ مگر پہلی چیز خدمت کے لئے آمادگی ہے، اور اس کا اظہار ابھی سے ہو جائے تو بہتر ہے، تاکہ جب وقت آئے اور اس مرکزی ادارے کے کام کو ہندوستان کے اطراف و جوانب میں پھیلانے کی ضرورت ہو، تو سابقین اولین کی طرف رجوع کیا جائے۔

آیت الکرسی

از

مولانا عبد اللہ العمادی

(۱)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو بات بیان کی ہے کھول کر بیان کی ہے۔ اس کو دنیا کے ہر ایک طبقہ کی ہدایت کرنا ہے۔ اس لئے انداز بیان اس قدر واضح شگفتہ اثر ریز اور دل نشین ہے کہ اعلیٰ و ادنی سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور نئی فرنگی جمعیت سے لے کے پرانی امیر کانی جماعت تک کو اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے، لیکن دشوار پسند طبیعتیں اتنی ساری توضیح پر بھی قرآن کے مفہوم میں اس قدر مختلف ہیں اور ان اختلافات نے اتنے دور از کار جھگڑے پیدا کر رکھے ہیں کہ ایک ایک کے مقابلہ و تکذیب پر آمادہ ہے!

یہ اختلافات بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کے طرز ادا میں غور نہ کرنیکی وجہ سے واقع ہوئے ہیں۔ قرآن کے انداز بیان و اسلوب کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے پیچیدہ طبیعتیں خود اُسکو پیچ در پیچ بناتی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ الفاظ سے مطلب نکالا جاتا فلسفہ کی نظر سے اس میں نکتہ آفرینی کی جاتی ہے اور مضمون میں اور بھی گرہیں پڑتی جاتی ہیں۔

ذوق عشق است کہ دشوار پسند افتاد است
ورنہ سودائے سر زلف تو دشوار نبود

مثلاً:۔

قرآن نے ایک مقام پر توضیح کی ہے کہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (خدا کی کرسی آسمان وزمین کو وسیع ہے) اہل نظر کو کرسی کا مفہوم متعین کرنا تھا اس لئے خوب خوب توجیہیں کی گئیں۔ اور پھر کسے برحسب فہم گمانے دارد" کا نظارہ اچھی طرح آنکھوں کے سامنے آگیا۔ یہ اختلافات قابل دید ہیں۔

الف[۱]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جس پر قدم ٹکاتے ہیں۔

ب[۲]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جہاں خدا کے پاؤں ٹکتے ہیں یہ جگہ (کرسی) عرش کے روبرو ہے۔

ج[۳]۔ خدا کی کرسی اتنی بڑی ہے کہ آسمان وزمین اس کے جوف میں سما سکتے ہیں۔

د[۴]۔ خدا کا عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور اس قدر بڑا ہے جیسے ایک میدان میں لوہے کا چھوٹا سا حلقہ بے حقیقت سا نظر آ رہا ہو۔

ھ[۵]۔ عرش وکرسی دونوں ایک ہیں۔

و[۶]۔ خدا کی کرسی آسمان کے اوپر ہے۔

ز[۷]۔ خدا کی کرسی زمین کے نیچے ہے۔

---

[۱] عن علی بن مسلم الطوسی عن عبد الصمد بن عبد الوارث عن ابیہ عن محمد بن جحادۃ عن سلمۃ ابن کہیل عن عمارۃ بن عمیر عن ابی موسیٰ قال الخ۔

[۲] عن موسیٰ بن ھارون عن عمرو عن اسباط عن السدی۔

[۳] عن السدی۔

[۴] عن یونس عن ابن وھب عن ابن زید عن ابیہ وبروایۃ اخری عن ابی ذر۔

[۵] عن المثنی عن اسحاق عن ابی زھیر عن جویبر عن الضحاک عن الحسن۔

[۶] عن الحسن وقال النیسابوری قد وردت الاخبار بان الکرسی دون العرش وفوق السماء السابعۃ

[۷] روی النیسابوری فی رغائبہ عن السدی ان الکرسی تحت الارض۔

ح[۱]۔ خدا کی کرسی میں زمین وآسمان سب سما سکتے ہیں۔ خدا اس پر بیٹھا کرتا ہے اور اُس کرسی میں اس کی پوری سمائی ہوجاتی ہے۔ چار اُنگل بھی زیادتی نہیں ہونے پاتی۔ اُس سے چرچراہٹ کی آواز بھی آتی ہے جس طرح کسی بھاری بھرکم آدمی کے بیٹھنے سے چرچراہٹ پیدا ہوتی ہے۔

ان اختلافات سے کرسی کا مفہوم تو کیا واضح ہوتا خدا کی خدائی میں شک پڑ گیا۔ کرسی کو ایک مقام یا محل مانو۔ خدا کو جسم قرار دو۔ اس کی نشست کے لئے تخت وکرسی بناؤ۔ اور انسان سے خدا کی مشابہت ثابت کرنے کے لئے اس قدر مبالغہ کرو کہ کرسی پر بیٹھنے میں بعض اوقات چولوں سے جو آواز نکلتی ہے اس کی تحقیقات بھی کر چھوڑو۔ اب بات کیا رہ گئی۔ خدا سے ایک یارانہ واتحاد کا ثبوت دنیا باقی تھا۔ شاعری نے اس کی تکمیل بھی کر دی "وہ کہے اللہ ہو اور میں کہوں اللہ ہوں!"

(۲)

اہل علم کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا۔ انھیں چار ناچار کسی طرح بات کو سلجھانا پڑا۔ علامہ زمخشری وقفال مروزی نے اس کی نہایت لطیف توجیہ کی ہے صاحب رغائب فرماتے ہیں۔

قیل المقصود من الکلام تصویر عظمة الله وکبریائه ولا کرسی ثمہ ولا قعود ولا قاعد واختاره جمع من المحققین کالقفال والزمخشری تقریره انه یخاطب الخلق فی تعریف ذاته وصفاته بما اعتادوا فی ملوکھم فمن ذلك انه جعل الکعبة بیتا له یطوف الناس به کما یطوفون

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کلام کی غرض دراصل خدا کی عظمت وجلال کی تصویر کھینچنا ہے۔ ورنہ حقیقت میں نہ وہاں کرسی ہے نہ نشست ہے اور نہ کوئی بیٹھنے والا ہے۔ اس توجیہ کو قفال و زمخشری جیسے محققوں کی ایک جماعت نے پسند بھی کیا ہے اس کی تقریر یوں ہے کہ خدا اپنی ذات وصفات سے روشناس کرانے کے لئے مخلوقات سے اسی طرح خطاب کرتا ہے جس کے خوگر بادشاہوں کے ساتھ لوگ ہوا کرتے ہیں مثلاً

[۱] عن عبداللہ بن ابی زیاد القسطوانی عن عبید اللہ بن موسی عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن عبداللہ بن خلیفہ

بیوت ملوکھم وامرا الناس بزیارته کما یزور
الناس بیوت ملوکھم وذکر الحجر الاسود
انه یمین اللہ فی ارضه ثم جعله مقبل
الناس کما یقبل ایدی الملوك وکذلك ما
ذکر فی القیامة من حضور الملائکة والنبیین
والشہداء ووضع الموازین وعلی ھذا القیاس
اثبت لنفسه عرشا فقال "الرحمٰن علی
العرش استوی" ووصف عرشه فقال
"وکان عرشه علی الماء" ثم قال "و
تری الملائکة حافین من حول العرش" ثم
قال "ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذ
ثمانیة" ثم اثبت لنفسه کرسیا ولما
توافقنا ان المراد من الالفاظ الموھمة
للتشبیه فی الکعبة والطواف والحجر
ھو تعریف عظمة اللہ وکبریائه فکذا
الالفاظ الواردة فی العرش والکرسی

جس طرح لوگ اپنے بادشاہ کے محل میں آمد و رفت رکھتے
ہیں، اور ارد گرد پھرتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی کعبہ کو
اپنا گھر قرار دیا ہے کہ اس کا طواف کیا جائے اور سلاطین
کے گھروں کی طرح اس کی بھی زیارت ہو۔ حجر اسود کو کہا کہ
زمین پر یہ خدا کا داہنا ہات ہے۔ پھر اس کو بوسہ گاہ بنا
اور اسی طرح جیسے کہ بادشاہوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے
ہیں۔ قیامت میں فرشتوں پیغمبروں۔ اور شہیدوں کا
حاضر ہونا اور میزان (ترازو) کا رکھا جانا۔ یہ سب اسی
رنگ میں ہے۔" اور اسی انداز میں خدا نے اپنے لئے ایک
تخت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اور فرمایا ہے "خدا تخت پر قائم
ہے" تخت کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ "خدا کا تخت پانی پر
تھا" پھر فرمایا ہے "تو دیکھیگا کہ تخت کے ارد گرد کو فرشتے
گھیرے ہوئے ہیں" ایک اور مقام پر ہدایت کی ہے کہ
"تیرے پروردگار کے تخت کو اس دن آٹھ فرشتے اٹھائے
ہوئے ہوں گے" ان سب کے بعد خدا نے اپنے لئے ایک
کرسی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ چونکہ ہمارا اتفاق یہ ہے کہ
کعبہ وطواف وحجر کے الفاظ جن سے تشبیہ کا وہم پیدا ہوتا ہے۔ اصل میں ان الفاظ سے خدا کی عظمت و کبریائی کو
روشناس کرنا مقصود ہے اس لئے عرش وکرسی کے باب میں جو الفاظ وارد ہیں۔ ان سے بھی یہی مراد ہوگی" [1]

[1] غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنیسابوری (علی ہامش ابن جریر) جلد ۳ صفحہ ۴۱۹

یہ تاویل ماننے کے قابل ہے لیکن پہلے یہ فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ جن الفاظ کی تاویل کی جاتی ہے وہ آیا واقع میں تاویل طلب ہیں؟ اور طواف کعبہ۔ بوسۂ حجر اسود۔ قیامت میں فرشتوں پیغمبروں اور شہیدوں کا دربار۔ انسانی اعمال کو تولنے والی ترازو۔ عرش۔ کرسی۔ ان سب کا آیا وہی مفہوم ہے جس کو ہم لازمۂ انسانی سمجھ رہے ہیں؟ اور خدا کی خدائی کو اس سے منزّہ و مبرّا مان کر بات بنانے کی فکر میں ہیں یہ فیصلہ ہو گیا تو مسألہ خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور قرص آفتاب کو مشعل لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

(۳)

اس مقام پر ہم کو صرف آیۃ زیر بحث کی تحقیق کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کرسی کے لفظ سے تاویل کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس لئے پہلے اسی معنے کو حل کر لینا چاہئے۔ وہ مشہور آیت جس میں یہ لفظ وارد ہوا ہے تمام کمال یوں ہے :-

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔	اللہ (وہ ذات پاک ہے) اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ زندہ (کارخانہ عالم کا) سنبھالنے والا۔ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کی جناب میں (کسی کی) سفارش کرے۔ جو کچھ لوگوں کے پیش آ رہا ہے (وہ) اور جو کچھ ان کے پیچھے (ہو گزرا ہے) (وہ) اس کو سب معلوم ہے اور لوگ اس کے معلومات میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں مگر جتنے پر وہ چاہے اس کی

کرسی آسمان و زمین (سب) پر حاوی ہے۔ اور آسمان و زمین کی حفاظت اس پر مطلق گراں نہیں اور وہ

بڑا عالیشان (ہے اور) اس کی بڑی بارگاہ ہے[۱]۔

اس آیت میں آٹھ باتیں مذکور ہیں۔

الف۔ اکیلا ایک خدا ہی معبود ہونے کے لائق ہے اس لئے کہ شان معبودی صرف اسی کی ذات سے مخصوص ہے۔

ب۔ وہ زندہ ہے اور سارے جہان کے کام سنبھالے ہوئے ہے۔

ج۔ غفلت کا اس میں دخل تک نہیں۔ کام میں لگا ہوا ہے۔

د۔ ارادہ کا پکا ہے۔

ھ۔ اس کا علم نہایت وسیع ہے۔

و۔ آگے پیچھے سب کا اس کو علم ہے۔

ز۔ اس کا علم ایسا نہیں ہے کہ کوئی اپنی طاقت کے بل سے اس پر حاوی ہو جائے۔

ح۔ اس کی کرسی میں آسمان و زمین سب کی سمائی ہے۔

ط۔ آسمان و زمین کتنے ہی بھاری بھر کم ہوں لیکن خدا ان کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔

ی۔ وہ بڑا برتر و بلند مرتبہ ہے۔

اس ترتیب پر غور کرو اور دیکھو کتنا اچھا تسلسل ہے۔

لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ خدائے واحد کو معبود مانو۔ اس لئے کہ معبود ہونے کے لئے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں وہ اس کی ذات میں اور صرف اسی کی ذات میں پائے جاتے ہیں

یہ اوصاف درجہ بدرجہ بیان کئے ہیں جن میں صفت علم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور کئی طرح سے

---

[۱] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے منقول ہے مولوی صاحب موصوف نے کرسی کے معنی جن القویین پر سلطنت کے بیان کئے ہیں عظیم کے معنی (بڑی بارگاہ) بتائے ہیں جو محض غلط ہیں۔ عظیم کے اصلی معنی تو صاحب عظمت کے ہیں۔

اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

اوصاف کی جو ترتیب بھی اختیار قائم کی ہے اس کا اسلوب دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر ایک صفت کا نچلا سرا اپنے بعد والی صفت کے اوپری حصہ سے لگاؤ رکھتا ہے لیکن صفت (ح) کو (ط) سے تو لگاؤ ہے۔ مگر (ز) سے کوئی لگاؤ نہیں ہے علم کے ساتھ کرسی کو کیا مناسبت ہے؟

کرسی سے اگر بیٹھنے ہی کی کرسی مراد ہے اور وہ بھی اتنی بڑی کہ آسمان وزمین کو حاوی ہو تو جہاں یہ صفت بیان کی تھی کہ خدا آسمان وزمین کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔ وہاں اسی ذیل میں کرسی کا تذکرہ کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ کرسی تو آسمان وزمین سب سے بڑی تھی۔ بڑی چیز کو چھوڑ کر چھوٹی چیز کے بار اٹھانے کے تذکرہ میں کیا بلاغت ہو سکتی ہے؟

(۴)

واقعہ یہ ہے کہ کلام عرب میں دراصل "کرسی" وہ ہے جس کا لوگ سہارا لیتے ہیں، زجاج کا قول ہے:۔

الذی نعرفہ من الکرسی فی اللغۃ الشیٔ الذی یعتمد علیہ (کرسی کے متعلق زبان میں جو معروف ہے وہ اسی قدر ہے کہ کرسی وہ ہے جس کا سہارا لیں) اسی لحاظ سے جس پر حکومت غالب تھی اور حکومت ہی کو سب سے بڑا سہارا مانتا تھا اس نے "کرسی" کے معنی حکومت قرار دیے، جو بیٹھنے کی چیز کے سہارے پر قانع تھے وہ اس سے کرسی متعارف سمجھے، اور جن کی نظر خالص کلام عرب پر تھی ان کے نزدیک سب سے بڑا انسانی سہارا علم تھا اس لئے "کرسی" کے معنی علم کے ہو گئے، قدمائے اہل زبان میں علم کے لئے کرسی کا لفظ متداول تھا کہتے تھے: کرس الرجل - ای ازدحم علمہ علیٰ قلبہ۔[۱]

آؤ اس کے فیصلہ کے لئے سلف صالح کو حکم بنائیں۔

علامہ ابوجعفر ابن جریر طبری جن کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے[۲]

---

[۱] لسان العرب۔ ج ۸۔ ص ۷۷۔ [۲] ابن جریر طبری نے ۳۱۰ھ / ۹۲۲ء میں وفات پائی۔ ان کی تفسیر کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائنی

بقیہ بر صفحہ ۲۱۹

ہر ایک بات میں روایت کے پابند ہیں اور گو ان کا خاص ذوق یہ ہے کہ حدیث کے نام سے چاہے کیسی ہی بات کہی جائے وہ سب کی روایت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں؟ تاہم بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ایک بات کے متعلق مختلف انداز کی روایتیں جمع کر دیتے ہیں جن سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے اور ان کی اس بات میں کیا رائے تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں بھی حسب معمول متعدد روایتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اما الذی یدل علی صحتہ ظاھر القرآن فقول ابن عباس الذی رواہ جعفر بن ابی مغیرۃ عن سعید بن جبیر عنہ انہ قال "ھو (ای الکرسی) علمہ" و کذالک لدلالۃ قولہ تعالیٰ ذکرہ "ولا یؤدہ حفظھما" علی ان ذلک کذلک فاخبر انہ لا یؤدہ حفظ ما علم و احاط بہ مما فی السموٰت والارض وکما اخبر عن ملائکتہ انھم قالوا فی دعائھم "ربنا وسعت کل شیٔ رحمۃ وعلما" فاخبر تعالیٰ ذکرہ	لیکن وہ بات جس کے صحیح ہونے پر کھلم کھلا قرآن دلالت کر رہا ہے تو وہ ابن عباس کا قول ہے جسے جعفر بن مغیرہ نے سعید بن جبیر کے حوالے سے بیان کیا کہ ابن عباس کہتے تھے کہ۔ آیۃ الکرسی میں "کرسی سے مراد خدا کا علم ہے"۔ ابن عباس نے یہ بات اس لئے کہی کہ آیت "آسمان وزمین کی نگہبانی خدا کو نہیں تھکاتی" خود اس پر دلیل ہے۔ خدا نے اطلاع دی ہے کہ آسمان وزمین میں جو کچھ بھی ہے خدا کو سب کا علم ہے اور سب پر وہ محیط ہے۔ ان میں سے کسی کی حفاظت اس کو تھکا نہیں سکتی۔ اسی طرح اپنے فرشتوں کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اپنی دعا میں کہتے ہیں "اے ہمارے پروردگار تیری رحمت اور تیرا علم ہر ایک چیز کو وسیع ہے"۔ اس مذکور سے یہ آگاہ کرنا مقصود تھا کہ خدا کا علم

تکملہ صفحہ ۲۱۸ - کی رائے ہے کہ لوسافر رجل الی الصین حتی یحصل لہ کتاب تفسیر محمد بن جریر لم یکن ذلک کثیرا۔ (تفسیر ابن جریر کے لینے کے لئے اگر کوئی شخص چین تک چلا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی ملاحظہ ہو طبقات الشافعیۃ لابن السبکی) ۱۳۲۱ھ میں یہ تفسیر مصر کے مطبع میمنیہ میں چھپ گئی ہے؛

ان علمه وسع كل شئ فكذلك قوله "وسع كرسيه السمٰوٰت والارض" واصل الكرسي العلم ومنه قيل للصحيفة يكون فيها علم مكتوب كراسة ومنه قول الراجز في صفة قانص:—

"حتى اذا ما اختارها تكرسا"

يعني علم۔ ومنه يقال للعلماء الكراسي لانهم المعتمد عليهم كما يقال اوتاد الارض يعني بذلك انهم العلماء الذين تصلح بهم الارض ومنه قول الشاعر۔

تحف بهم بيض الوجوه وعصبة
كراسي بالاحداث حين تنوب

يعني بذلك علماء بحوادث الامور ونوازلها۔[1]

ہر چیز کو حاوی ہے لہٰذا اسی طرح آیت "اس کی کرسی آسمان وزمین کو حاوی ہے" میں کرسی سے مراد علم ہی ہے یعنی خدا کا علم آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب کو حاوی ہے کرسی کے اصلی معنی بھی علم ہی کے ہیں۔ کراسہ اسی لفظ سے نکلا ہے جس کے معنی جزو کتاب کے ہیں جس میں علمی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ راجز شاعر نے اسی بنا پر ایک شکاری کی صفت میں کہا تھا

"حتی اذا ما اختارھا تکرسا"

اس میں تکرس سے علم ہی مراد ہے۔ علما کو بھی اسی لئے کراسی کہتے ہیں۔ کیونکہ انہیں پر اعتماد ہوا کرتا ہے۔ انھیں "اوتاد الارض" (زمین کی میخ) بھی کہا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ان علما میں ہیں جن کی بدولت زمین سنبھلی ہوئی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:—

تحف بهم بيض الوجوه وعصبة
كراسي بالاحداث حين تنوب

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے کرسی یعنی عالم ہیں جن کو حوادث اور مصیبتوں کی خبر رہا کرتی ہے۔

قدیم بزرگان اہل تشیع کو بھی اس معنے سے اتفاق ہے اور ائمہ اثنا عشر میں دو امام ابو جعفر و ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے یہی مطلب ماثور ہے۔ اس فرقے کے سب سے بڑے مفسر علامہ طبرسی ہیں جن کی کتاب

[1] تفسیر ابن جریر ج ۳۔ ص ۷، ۸۔

مجمع البیان میرے سامنے ہے۔ وسع کرسیہ کی چار تاویلیں کی ہیں جن میں پہلا نمبر یہ ہے کہ کرسی کے معنی علم ہیں

وسع علمه السموٰت والارض، عن ابن عباس ومجاهد وهو المروی عن ابی جعفر و ابی عبدالله [1]	ابن عباس اور مجاہد کی روایت میں کرسی سے علم مراد ہے۔ امام ابو جعفر اور امام ابو عبداللہ سے بھی یہی معنی مروی ہیں۔

اسمٰعیلی بھی اسی معنی کے قائل ہیں۔ "مجالس مؤیدیہ" کی ایک مجلس اسی کے لئے مخصوص ہے صوفیہ بھی اسی جانب مائل ہیں، شیخ اکبر محی الدین بن عربی صاحب فصوص وفتوح اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

وسع کرسیه السموٰت والارض ای علمه اذ الکرسی مکان العلم الذی هو القلب کما قال ابویزید البسطامی رحمة الله علیه "لو وقع العالم وما فیه الف الف مرة فی زاویة من زوایا قلب العارف ما احس به لغایة سعته" [2]	"وسع کرسیہ" میں "کرسی" سے مراد اللہ کا علم ہے۔ کرسی محل علم ہے اور اسی کا نام قلب ہے بایزید بسطامی فرماتے ہیں کہ "عارف کے کسی ایک گوشۂ قلب میں اگر تمام جہان مع اپنے تمام موجودات کے ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہزار ہزار مرتبہ جا پڑے تو کمال وسعت قلب کے باعث عارف کو یہ محسوس تک نہ ہو!

اس تصریح نے تمام عقدے حل کر دیئے اور بتا دیا کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اُس میں کرسی کا مفہوم کیا تھا اور کن مطالب کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا

[1] تفسیر مجمع البیان ج ۱ ص ۳۸۱۔

[2] تفسیر ابن عربی۔ ص ۸۹۔

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی

(۴)

زندگی کا نصب العین

تصورِ حیات کے بعد دوسرا سوال جو ایک تہذیب کے حسن و قبح کو جانچنے میں خاص اہمیت رکھتا ہے یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے کونسا نصب العین پیش کرتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رخ فطری طور پر اسی منتہا اور اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے جس کو اس نے اپنا نصب العین اور مطمح نظر قرار دیا ہے۔ اسی کے صحیح یا غلط ہونے پر ذہنیت کی اچھی یا بری تشکیل اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کی درستی یا نادرستی کا انحصار ہے۔ اسی کے بلند یا پست ہونے پر افکار و تخیلات کی بلندی و پستی اخلاق و آداب کی فضیلت و رذیلت، اور معیشت و معاشرت کی رفعت و دنائت کا مدار ہے۔ اسی کے واضح اور متعین ہونے یا نہ ہونے پر انسان کے ارادوں اور خیالات کا مجتمع یا پراگندہ ہونا، اس کی زندگی کے معاملات کا ہموار یا ناہموار ہونا، اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا ایک راہ میں صرف ہونا یا مختلف راہوں میں منتشر ہو جانا موقوف ہے۔ بالجملہ نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر و عمل کی بہت سی راہوں میں سے کوئی ایک راہ انتخاب کرتا، اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور اپنے مادی و روحانی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ لہٰذا جب ہم کسی تہذیب کو نقد صحیح کے معیار پر جانچنا چاہیں تو ہمارے لئے اس کے نصب العین کی جستجو ناگزیر ہے

صحیح اجتماعی نصب العین کے لازمی خصائص

لیکن بحث و تحقیق کی راہ میں قدم اٹھانے سے پہلے ہم کو یہ متعین

کر لینا چاہیئے کہ تہذیب کے نصب العین سے ہماری مراد کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جب ہم "تہذیب" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد افراد کی شخصی تہذیب نہیں ہوتی بلکہ ان کی اجتماعی تہذیب مراد ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فرد کا شخصی نصب العین، تہذیب کا نصب العین نہیں ہو سکتا لیکن برعکس اس کے یہ لازم ہے کہ ایک تہذیب کا جو نصب العین ہو وہ اس تہذیب کے متبعین میں سے ہر ہر فرد کا نصب العین ہو، عام اس سے کہ ہر فرد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے تہذیب کا نصب العین وہ ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کی ایک بڑی جماعت کا مشترک اجتماعی نصب العین بن گیا ہو، اور اس نے افراد کے شخصی نصب العین پر اتنا غلبہ پا لیا ہو کہ ہر فرد بجائے خود وہی نصب العین رکھتا ہو جو پوری جماعت کے پیش نظر ہے۔

اس قسم کے اجتماعی نصب العین کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ وہ افراد کے شخصی نصب العین سے کامل موافقت و مناسبت رکھتا ہو اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ معاً انفرادی اور اجتماعی نصب العین بن سکے۔ اس لئے کہ اگر اجتماعی نصب العین، افراد کے شخصی انصاب العیون سے منافات کی نسبت رکھتا ہو تو اولاً اس کا اجتماعی نصب العین بننا ہی مشکل ہوگا، کیونکہ جس خیال کو افراد فرداً فرداً قبول نہ کریں وہ اجتماعی حیا نہیں بن سکتا۔ اور اگر کسی زبردست اثر کے تحت وہ اجتماعی نصب العین بن بھی گیا، تو فرد کے نصب العین اور جماعت کے نصب العین میں غیر محسوس طور پر ایک کشمکش برپا رہے گی، تا آنکہ اس غالب اثر کے کمزور ہوتے ہی افراد اپنے اپنے نصب العین کی طرف پھر جائیں گے، جماعت کا نصب العین باطل ہو جائے گا، ہیئت اجتماعی کی قوت جاذبہ و رابطہ فنا ہو جائے گی اور تہذیب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ اس لئے تہذیب کا صحیح نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو حقیقتۃً انسان کا فطری نصب العین ہو، اور ایک تہذیب کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ ایسا اجتماعی نصب العین پیش کرے جو بعینہ انفرادی نصب العین بھی بن سکتا ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ہمارے سامنے دو سوال آتے ہیں جن کو حل کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے:۔

ایک یہ کہ فطرۃً انسان کا شخصی نصب العین کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ دنیا کی دوسری تہذیبوں نے جو نصب العین پیش کئے ہیں وہ کس حد تک انسان کے اس فطری نصب العین سے مناسبت رکھتے ہیں؟

انسان کا فطری نصب العین

انسان کے فطری نصب العین کا سوال، دراصل یہ سوال ہے کہ انسان فطری طور پر دنیا میں کس مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے، اور اس کی طبیعت کس چیز کی خواہشمند ہوتی ہے؟ اس کی تحقیق کے لئے اگر آپ فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھیں کہ وہ دنیا میں کیا چاہتا ہے، تو آپ کو مختلف لوگوں سے مختلف جوابات ملیں گے اور شاید کوئی دو آدمی بھی ایسے نہ ملیں جن کے مقاصد اور جن کی خواہشات بالکل یکساں ہوں لیکن ان سب کا استقصاء کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ لوگوں نے جن چیزوں کو مقاصد قرار دیا ہے۔ وہ دراصل فی نفسہ مقصود نہیں ہیں بلکہ ایک مقصود تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، اور وہ واحد مقصود خوشحالی و اطمینان قلب ہے۔ ہر شخص خواہ وہ کسی مرتبۂ عقلی و ذہنی اور کسی طبقہ عمرانی سے تعلق رکھتا ہو۔ اور خواہ وہ کسی شعبۂ حیات اور کسی میدان عمل میں جدوجہد کر رہا ہو، اپنی کوششوں کے لئے ایک ہی نصب العین رکھتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسے امن، سلامتی، خوشی، اور جمعیت خاطر نصیب ہو۔ لہٰذا اس کو ہم ہر فرد انسانی کا فطری نصب العین کہہ سکتے ہیں

دو مقبول اجتماعی نصب العین اور ان پر تنقید

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو اجتماعی نصب العین پیش کئے ہیں ان کو بھی اگر جزئیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جائیں گے، جن کا حصر کرنا نہ یہاں مقصود ہے اور نہ ممکن لیکن اصولی حیثیت سے ہم ان سب کو دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ جن تہذیبوں کی بنیاد کسی مذہبی و روحانی تخیل پر نہیں ہے انہوں نے اپنے متبعین کے سامنے تفوق و برتری کا نصب العین پیش کیا ہے۔ یہ نصب العین متعدد اجزاء سے مرکب ہے جن میں سے خاص اور اہم اجزاء ترکیبی یہ ہیں:

سیاسی غلبہ و استیلاء کی طلب۔

دولت و ثروت میں سب سے بڑھ جانے کی خواہش، عام اس سے کہ وہ فتح ممالک کے ذریعے

ہو یا تجارت وصنعت پر حاوی ہوجانے کی بدولت۔

عمرانی ترقی کے مظاہر میں سب پر سبقت لیجانے کی خواہش خواہ وہ علوم وفنون کے اعتبار سے ہو، یا آثار مدنیت وتہذیب میں شان وشکوہ کے اعتبار سے۔

یہ اجتماعی نصب العین بظاہر نظر میں اس شخصی نصب العین کے منافی نہیں ہے جس کا اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔ کیونکہ ادنیٰ غور وتأمل کے بغیر یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ اگر جماعت کا یہ نصب العین متحقق ہوجائے تو فرد کا نصب العین مع شیئٍ زائدٍ متحقق ہوجائے گا۔ اس نصب العین کی یہی ظاہر فریبی ہے جس کی بدولت ایک قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد اپنے شخصی نصب العین کو اس میں گم کر دیتے ہیں لیکن تعمق نظر اور بصیر علمی تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ اجتماعی نصب العین، فرد کے فطری نصب العین سے سخت منافات رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں تفوق وبرتری کا یہ نصب العین رکھنے والی صرف ایک ہی قوم نہیں ہوتی، بلکہ ایک زمانہ میں متعدد قومیں اپنے سامنے یہی نصب العین رکھتی ہیں اور وہ سب اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں شدید سیاسی معاشی اور تمدنی کشمکش برپا ہوتی ہے، مسابقت، مقابلہ اور مزاحمت کے زبردست ہنگامے رونما ہوتے ہیں اور شورش واضطراب کے عالم میں افراد کو امن وسکون، خوشحالی واطمینان قلب کا میسر آنا قریب قریب محال ہوجاتا ہے چنانچہ آج یہی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے مغربی ممالک میں درپیش ہے تاہم اگر ایک زمانہ ایسا بھی فرض کر لیا جائے جس میں صرف ایک قوم اس نصب العین کے لئے کوشش کرنے والی ہو، اور کوئی دوسری قوم اس نصب العین کی خاطر اس کی مزاحمت کرنے والی نہ ہو، تب بھی اس کی کامیابی میں افراد کے شخصی نصب العین کا تحقق ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ ایسے اجتماعی نصب العین کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مقابلہ ہی نہیں پیدا کرتا، بلکہ خود ایک قوم کے اپنے افراد میں باہم مسابقت کی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت قوم کے ہر فرد کا مقصد حیات یہ ہوجاتا ہے کہ وہ دوسرے ابنائے قوم پر غلبہ حاصل کرلے، دولت، حکومت، طاقت، شان وشوکت، اور اسباب عیش ونعمت میں سب سے بڑھ جائے، دوسروں کے رزق کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں آجائیں، جتنے وسائل

ثروت ممکن ہوں ان کا اجارہ اس کی ذاتِ واحد کو حاصل ہو جائے فوائد و منافع اس کا حصہ ہوں، اور خسران و نامرادی دوسروں کا حصہ۔ صاحب امر وہ ہو اور دوسرے اس کے مطیع و دست نگر رہیں اول تو اس قسم کے لوگوں کی حرص و طمع کسی مرتبہ پر بھی پہنچ کر قانع نہیں ہوتی اس لئے وہ ہمیشہ غیر مطمئن اور بے چین رہتے ہیں۔ دوسرے اس نوع کا مقابلہ جب ایک قوم کے خود اپنے افراد میں پیدا ہو جاتا ہے، تو اس میں ہر گھر اور ہر بازار ایک میدان جنگ بن جاتا ہے اور امن و اطمینان، سکون و سلامتی اور مسرت و خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے، خواہ دولت و حکومت اور اسباب نعمت کی کتنی ہی کثرت ہو۔

علاوہ بریں یہ ایک فطری بات ہے کہ خالص مادّی ترقی جس میں روحانیت کا کوئی حصہ نہ ہو، انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتی۔ کیونکہ محض حسّی لذات کا حصول ایک خالص حیوانی نصب العین ہے، اور اگر یہ صحیح ہے کہ انسان حیوانِ مطلق سے زائد کوئی چیز ہے، تو یقیناً یہ بھی صحیح ہونا چاہئے کہ انسان کو محض ان چیزوں کا حصول مطمئن نہیں کر سکتا جن کی لذتیں صرف اس کی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لئے کافی ہو سکتی ہیں۔

۲۔ جن تہذیبوں کی بنیاد مذہبی و روحانی تخیل پر رکھی گئی ہے انہوں نے عموماً اپنا نصب العین نجات کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اس نصب العین میں وہ روحانی عنصر موجود ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان قلب بخشتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ نجات جس طرح ایک قوم کا نصب العین بن سکتی ہے اسی طرح فرداً فرداً ہر شخص کا نصب العین بھی بن سکتی ہے لیکن زیادہ گہری تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ نصب العین ایک صحیح نصب العین ہی نہیں بن سکتا۔ اس کے چند وجوہ ہیں

اولاً، نجات کے نصب العین میں ایک طرح کی خود غرضی چھپی ہوئی ہے۔ جس کا خاصہ یہی ہے کہ اجتماعیت کو کمزور کر کے انفرادیت کو قوت پہنچائے کیونکہ جب ہر شخص بجائے خود چند خاص اعمال انجام دے کر نجات حاصل کر سکتا ہو تو اس نصب العین میں کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جو اس کو انفرادی کے بجائے اجتماعی حیثیت دینے والی، اور اس کے تحقق کے لئے فرد کو جماعت کے ساتھ اشتراک عمل پر ابھارنے والی ہو یہ انفرادیت کی روح اس مقصد کے بالکل خلاف ہے جو تہذیب کا من حیث التہذیب عین مقصد ہے۔

ثانیاً، نجات کا مسئلہ در اصل طریقہ حصول نجات کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اس نصب العین کے صحیح یا غلط ہونے میں اس طریقہ کے صحیح یا غلط ہونے کو بھی بہت کچھ دخل حاصل ہے جو اس تک پہنچنے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ مثلاً جن مذاہب نے ترک دنیا اور رہبانیت کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے، ان میں نجات نہ انفرادی نصب العین بن سکتی ہے اور نہ اجتماعی۔ ایسے مذاہب کے متبعین آخر کار دین کو دنیا سے الگ کرنے اور دنیا داروں کی نجات کے لئے بیچ کے راستے مثلاً دین داروں کی خدمت یا کفارہ وغیرہ اشکال لینے پر مجبور ہوئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو نصب العین یکسانی و یکجانی کے ساتھ فرد اور جماعت کا مشترک نصب العین نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ دینداروں کی ایک قلیل تعداد کے سوا باقی پوری جماعت کیلئے اس نصب العین میں وہ رفعت۔ وہ اہمیت وہ جاذبیت، اور وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو اسے اپنا گرویدہ بنائے رکھتی، اس لئے تمام دنیا دار اس کو چھوڑ کر اُس مادی نصب العین کے پیچھے پڑ گئے جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ دوسری طرف جن مذاہب نے نجات کو مختلف دیوتاؤں اور معبودوں کی خوشنودی پر موقوف قرار دیا ہے، ان میں نصب العین کا اشتراک برقرار نہیں رہتا، مختلف گروہ مختلف معبودوں کی طرف پھر جاتے ہیں اور نصب العین کی وہ حقیقی وحدت ہی باقی نہیں رہتی جس کو قائم کرنا اور جس کے رشتہ میں اپنے تمام متبعین کو مربوط کر دینا ایک تہذیب کا اصلی کام ہے اس لئے ان مذہبوں کے پیرو بھی جب دنیوی ترقی کے راستے پر جانا اور اپنی جماعت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی دوسرے نصب العین کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک اور قسم مذاہب کی وہ ہے جس کی دعوت کا خطاب انسان بحیثیت انسان سے نہیں ہے، بلکہ کسی خاص نسل اور خاص جغرافی حدود میں رہنے والی قوم سے ہے۔ اور اس بنا پر اس کے نزدیک نجات بھی اس خاص نسل و قوم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ نصب العین بلاشبہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مرحلہ میں ایک کامیاب اجتماعی نصب العین بن سکتا ہے، مگر چونکہ یہ عقل صحیح کے معیار پر پورا نہیں اترتا اور نجات کا کسی مخصوص نسل کے لئے مختص ہونا ایسی بات ہے جس کو ماننے سے ہر سلیم الفطرت انسان کی عقل انکار کرتی ہے اس لئے ایسے مذاہب کے متبعین عقلی ترقی کی راہ میں چند ہی قدم آگے بڑھ کر اس نصب العین کے خلاف خود بغاوت کر دیتے ہیں اور اسکو اپنے ذہن سے خارج کر کے کوئی دوسرا نصب العین اختیار کر لیتے ہیں

ثالثاً، نجات کا نصب العین دینی و روحانی نقطۂ نظر سے خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو، لیکن دنیوی نقطۂ نظر سے اپنے اندر کوئی چیز ایسی نہیں رکھتا جو ایک قوم کو من حیث القوم ابھارنے والی اور اس کے اندر وہ حرارت، وہ قوت اور وہ حرکت پیدا کرنے والی ہو جو قومی ترقی کے لئے لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجتک کسی ترقی پسند قوم نے اس کو اپنا اجتماعی نصب العین نہیں بنایا، اور ان قوموں میں بھی اس کی حیثیت ہمیشہ ایک انفرادی نصب العین ہی کی رہی ہے، جن کے مذہب نے صرف یہی ایک نصب العین پیش کیا ہے۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ مادّی اور روحانی دونوں نصب العین نقدِ صحیح کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلامی تہذیب نے کس چیز کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے اور اس میں کیا خصائص ہیں جو اس کو ایک صحیح اجتماعی نصب العین بناتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین

میں اس مضمون کی تمہید ہی میں کہہ چکا ہوں کہ نصب العین کا سوال درحقیقت تصورِ حیات کے سوال سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں، اور دنیا میں اپنی حیثیت، اور اپنے لئے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہے وہی فطری طور پر زندگی کا ایک نصب العین پیدا کر دیتا ہے اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے تحقق کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اگر دنیا کو ہم اپنے لئے ایک چراگاہ تصور کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں زندگی عبارت ہے ایک مہلت سے جو ہم کو کھانے پینے اور لذات دنیا سے متمتع ہونے کے لئے ملی ہوئی ہے، تو بلاشبہ یہ حیوانی تصور ہمارے نفس میں زندگی کا ایک حیوانی نصب العین راسخ کر دیگا۔ اور ہم تمام عمر اپنے لئے حسّی لذّتوں کے سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

بخلاف اس کے اگر ہم نے اپنے آپ کو پیدائشی مجرم اور فطری گنہگار سمجھا ہے، اور دنیا کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ کوئی عقوبت خانہ اور عذاب کا گھر ہے جہاں اپنے اس پیدائشی جرم کی سزا بھگتنے کے لئے ہم پھینک دیئے گئے ہیں، تو قدرتی طور پر یہ تصور ہمارے نفس میں اس عذاب سے رہائی حاصل کرنے کی

خواہش پیدا کریگا، اور اس بنیاد پر ہم نجات کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں گے لیکن اگر دنیا کے متعلق ہمارا تصوّر چراگاہ اور دارالعذاب دونوں سے برتر ہو، اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو حیوان اور مجرم دونوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہوں تو یقیناً ہمارے نفس کو مادّی لذّات کی طلب اور نجات کے حصول دونوں سے زیادہ بلند نصب العین کی تلاش ہوگی، اور کسی پست اور ادنیٰ مطمح نظر پر ہماری نگاہ نہ ٹھیریگی۔

اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر جب آپ یہ دیکھیں گے کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے تو اس تصورِ حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جائیگی۔ ایک نائب کا بحیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہئے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے، اور اس کی نظر میں ایک اچھا، وفادار، متدین، اور فرض شناس ملازم قرار پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک نیت آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقا کی خدمت بجا لانے میں اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود بنا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس لئے بجالائے گا کہ اس کے معاوضہ میں اس کو کسی نفع کی طمع اور کسی ترقی یا انعام یا اضافۂ مناصبت یا جاہ و منزلت کی زیادتی کا لالچ ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ آقا اس سے خوش ہو کر اسے یہ سب کچھ عطا کر دے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقا اس کو حسن خدمت کے صلہ میں ان چیزوں کے بخش دینے کی امید دلائے، اور اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں نے ٹھیک طور سے فرائض انجام دیکر اپنے آقا کو خوش کر دیا تو وہ مجھے یہ یہ انعام دیگا لیکن اگر اس نے انعام کو اپنا مقصود بنا لیا، اور اپنے فرائض منفعت کی خاطر انجام دیے، تو کیا کوئی دانشمند ایسے ملازم کو ایک فرض شناس ملازم کہہ سکتا ہے؟ اسی مثال پر خدا اور اس کے نائب کے معاملہ کو بھی قیاس کر لو۔ اگر انسان روئے زمین پر خدا کا نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

یہ وہ نصب العین ہے جو اس تصورِ حیات سے خود عقل اور فطرت پیدا کرتی ہے۔ اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر ٹھیک یہی

نصب العین ہے جو اسلام نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات کا تتبع کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ طرح طرح سے اسی ایک نصب العین کو ذہن نشین کرنے اور قلب و روح میں بٹھا دینے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس کے سوا تمام دوسرے مطامح نظر کا پورے زور کے ساتھ ابطال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ

قُلْ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶ : ۲۰)

اے پیغمبر کہدے کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے جو تمام جہان کا رب ہے، اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ... فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹ : ۱۴)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لئے ہیں جن کے معاوضہ میں صرف انہیں کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں .... پس اپنے اس سودے پر جو تم نے (اپنے خدا سے) کیا ہے خوشی مناؤ حقیقت میں یہی بڑی کامیابی ہے۔

سورۂ بقر میں نافرمان اور فرمانبردار بندے کا فرق بتاتے ہوئے فرمانبردار بندے کی تعریف یہ کی ہے کہ :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (۲ : ۲۵)

اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان کو اللہ کی خوشنودی کی خاطر بیچ دیتا ہے، اور اللہ اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا ہے۔

سورۂ فتح میں مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوستی اور دشمنی

اور جن کا رکوع و سجود سب کچھ اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے :-

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰىھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا۔ (۴۸ : ۴)

محمد اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں تم ان کو رکوع و سجود کرتے ہوئے (ہی) دیکھو گے۔ یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں۔

سورۂ محمد میں کافروں کے اعمال ضایع ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کے لئے کچھ نہیں کرتے بلکہ دوسری اغراض کے لئے عمل کر کے خدا کی ناخوشی مول لیتے ہیں :-

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ (۴۷ : ۳)۔

ان پر مار اس لئے پڑے گی کہ انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے خدا کو ناخوش کر دیا۔ اور انہوں نے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کو پسند نہ کیا اس لئے اللہ نے ان کے اعمال اکارت کر دیے۔

سورۂ حج میں خدا کی ایسی عبادت کو جو فائدے کی خاطر ہو قطعاً بے کار، اور موجب نامرادی قرار دیا گیا ہے :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِہٖ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ نِ انْقَلَبَ عَلٰی وَجْھِہٖ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (۲۲ : ۲۰)

اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کی عبادت اکھڑے دل سے کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس سے مطمئن ہو گیا۔ اور اگر کوئی آزمایش کا وقت آگیا تو الٹا پھر گیا۔ ایسا شخص دنیا اور آخرت دونوں میں نامراد ہوا۔ اور یہی صریح گھاٹا ہے۔

سورۂ بقر میں بتایا گیا ہے کہ جو خیرات لوگوں کو دکھانے کے لئے کی جائے اور جس مال کو دے کر

آدمی احسان جتائے وہ باطل ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چٹان پر تھوڑی سی مٹی پڑی تھی تم نے اس میں بیج بویا، مگر پانی کا سیلاب آیا اور اس کو بہالے گیا بخلاف اس کے جو خیرات، ثبات نفس کے ساتھ خاص خدا کی خوشنودی کے لئے کی جائے اس کی مثال ایسے باغ کی سی ہے جس پر اگر خوب بارش ہو تو دوچند پھل لائے۔ اور اگر زور کی بارش نہ ہو، تب بھی ہلکی سی پھوار ہی اس کے پھلنے پھولنے کے لیے کافی ہوجائے (۲: ۳۶)۔

اس بات کو مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں سمجھایا گیا ہے کہ تم جو نیک عمل بھی کرو صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کرو، اور اس سے کوئی اور غرض نہ رکھو۔

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ (۲: ۳۷)	تم جو کچھ بھی خیرات کی مد میں خرچ کروگے اس کا فائدہ تمہارے ہی لئے ہے (مگر شرط یہ ہے کہ) جو کچھ تم خرچ کرو صرف خدا ہی کی رضاجوئی کے لئے کرو۔
وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳: ۷)	اور جن لوگوں نے اپنے رب کی رضاجوئی کے لئے صبر کیا اور نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی عطا کی تھی اس میں سے پوشیدہ یا ظاہر خرچ کیا اور جو لوگ نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر ایسے ہی لوگوں کیلئے ہے
وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ۔ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (۹۲)	اور عذاب نار سے وہ بڑا پرہیزگار بچ جائیگا جو پاکیزگی نفس کے ساتھ اپنا مال دیتا ہے اور اس کے نزدیک کسی کی نعمت اس کے اس عمل کی جزا نہیں ہے بلکہ وہ صرف اپنے بالا و برتر پروردگار کی خوشنودی چاہتا ہے اور خدا اس سے راضی بھی ہوگا۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۰:۴)

پس تو اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو (اس کا حق)، یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو خوشنودی الٰہی چاہتے ہوں اور حقیقت میں وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۰:۴)

جو زکوٰۃ تم نے دی اور اس سے تم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو تو جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہ اپنے دیے کو دوگنا چوگنا کر رہے ہیں۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۔ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۔ (۷۶:۱)

اور اللہ کی محبت کی خاطر مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خدا کے لئے کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ کوئی جزا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم کو تو اپنے رب سے اس دن کا خوف لگا ہوا ہے جب لوگوں کے منہ بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں پر شکنیں پڑ جائیں گی۔ پس اللہ نے ان کو اس دن کے شر سے بچا لیا اور ان کو تازہ روئی اور خوش حالی سے ہم آغوش کر دیا۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۵۹:۱)

فے میں ان غریب لوگوں کا حصہ بھی ہے جنھوں نے ہجرت کی ہے اور جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکالے گئے ہیں (اور جنہوں نے یہ سب کچھ اس لئے قبول کیا ہے کہ) وہ اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے کام آتے ہیں حقیقت میں یہی لوگ سچے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ

اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح

صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ - (۶۱ : ۴) صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ (۴ : ۷۶) - اور جو کافر ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں

اس تمام تعلیم کو صاحب جوامع الکلم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جملہ میں ادا فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ بیان فرما دیا ہے جو تمام معاملات اور عبادات پر پوری طرح حاوی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ اِلَّا مَا كَانَ لَهٗ خَالِصًا وَّابْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُهٗ - یعنی اللہ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالصاً اس کے لئے کیا جائے اور جس سے محض اسکی رضا جوئی مقصود ہو۔

افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

شیخ عبدالعزیز شاویش مرحوم کے خطبات

(خطبۂ دوم)

حضرات!

گذشتہ خطبہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بلاد مغرب میں علوم جدیدہ کا مرجع سترہویں صدی ہے جس میں کوپرنکس کے نظریہ اور نظریہ جذب وکشش اور نظریہ دوران خون، اور کیمیا وطبعیات کے جدید قوانین کا ظہور ہوا۔ اور لوگ سیاروں کے نظام اور تاروں کی کنہ اور ٹوٹنے والے تاروں کی کیفیت سے واقف ہوئے۔ مگر انیسویں صدی تک یہ اکتشافات ان غامض مسائل کونیہ کی تفسیر سے باز رہے جو بائبل کے عہد جدید اور عہد قدیم میں بیان کئے گئے ہیں، اور اگر انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ کیا بھی تو وہ بہت محدود تھا۔ پھر جب ان اکتشافات کی بنا پر مسائل کونیہ کی بحث شروع ہوی تو اس کے ساتھ ہی ان تاریخی روایات کی بحث بھی شروع ہو گئی جو ان کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً طوفان نوح اور سفر تکوین چنانچہ انیسویں صدی کے اوائل میں لاپلاس (Laplace) آیا اور اس نے ظاہر کیا کہ سفر تکوین میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہمیں وجود خالق کے نظریہ سے انکار کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر علم طبقات الارض کی تحقیقات نے ترقی کی اور اس نے ایسے مفروضات پیش کئے جو سفر تکوین اور قصۂ طوفان سے متناقص تھے۔

سنہ ۱۸۶۳ء میں پروفیسر لائل (Lyell) نے اپنی کتاب قدم الانسان میں بیان کیا کہ

انسان اس مدت سے بہت پہلے زمین پر آباد ہو چکا تھا جو تورات نے معین کی ہے۔ مگر اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان دونوں متناقض بیانات میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ شاید تورات میں جو مدت بیان کی گئی ہے اس کے دن بہت زیادہ طویل ہوں اور ہمارے دنوں کی طرح نہ ہوں لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی تطبیق ان ایام پر نہیں ہو سکتی جن میں انسان پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ تورات کے بیانات سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ وہ دن ایسے ہی تھے جیسے ہمارے موجودہ زمانے کے دن ہیں۔ بہرحال اس عہد کے فلاسفہ میں عام خیال یہ پھیل گیا تھا کہ علم طبقات الارض نے انجیل کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ کہنے کے لئے دروازہ کھلا ہوا تھا کہ نوع بشری کا وجود تاریخ سے پہلے کی بات ہے۔ چنانچہ لوگ اسی مذہب پر تھے کہ علم الحیوان نے انسان کی اصل کے متعلق ایک نئی تحقیق پیش کر دی اور انسان پر قانون نشو و ارتقا اور تمام نوامیس طبعی کو منطبق کیا۔ خصوصاً جب سے ڈارون کی کتاب اصل اجناس (Origin of Species) شایع ہوی ہے (۱۸۹۵ء) اس کو حقائق ثابتہ میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

۱۸۷۱ء میں جب ڈارون کی کتاب منشاء الانسان (The Descent of Man) شائع ہوی تھی اسی وقت سے ایک فکری شورش برپا ہو گئی تھی اور دینی و غیر دینی طبقوں کے درمیان جدال و نزاع کی آگ بھڑک اٹھی تھی حتی کہ گلیڈ اسٹون کے متعلق مشہور ہے کہ اس زمانہ میں اس نے کہا تھا کہ :-

> اگر ہم نظریہ نشو و ارتقا کو مان لیں تو اس کے اعتبار سے خدا کی یہ حیثیت رہ جائیگی کہ وہ ایک خالق تھا جس کا کام ختم ہو گیا۔ اور اگر قوانین کونیہ کے عدم تغیر کو تسلیم کر لیا جائے، اور یہ قرار دے لیا جائے کہ یہ قوانین ایک ہی حالت پر دائماً قائم رہنے والے ہیں تو دنیا میں خدا کی حکومت کی کوئی حاجت باقی نہ رہیگی

اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ صدی کے وسط تک مغرب کے غیر اسلامی ممالک میں مرکز عقل اور حریت فکر کا کیا حال رہا ہے تو اس کے لئے میں آپ کے سامنے صرف ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں

جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک انگریز کارڈینل کے اعلان کا یورپ میں کس طرح استقبال کیا گیا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ :-

"۱۸۶۴ء میں کارڈینل مانگ (Cardinal Manning) نے اپنے ایک اعلان سے تمام عالم نصرانیت کو حیرت زدہ کردیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہر انسان کو وہی اعتقاد رکھنا چاہئے جس کو وہ اپنی نظر وفکر کی بناء پر صحیح سمجھتا ہو۔ اور یہ کہ کنیسہ کو عقاید پر مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ امور ماوراء طبیعت کا علم ممکن ہے بلکہ اس علم کو تنہا حق اور کنیسہ کی رغبتوں ہی کا پابند نہ ہونا چاہئے۔ اور یہ کہ کیتھولک فرقہ والوں کو حق ہے کہ دوسری ملتوں سے نکل جانے والے لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں۔ اور انھیں حق ہے کہ اپنی نماز بآواز بلند پڑھیں۔ اور یہ کہ یورپ علمی ترقی اور حریت اور مدنیت کے ساتھ سلامت رہ سکتا ہے"

دیکھئے تو سہی کہ مورخوں نے اس اعلان کو ان بڑے حادثوں میں شمار کیا ہے جنہوں نے عالم نصرانیت کو حیرت زدہ اور مدہوش کردیا حالانکہ بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کارڈینل نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا ہے جو عالم اسلامی کو اس وقت سے معلوم ہے جب سے قرآن کا نور دلوں پر تاباں ہوا ہے۔ اور اس کی وہ فطری تعلیمات عالم انسانی پر جلوہ فگن ہوئی ہیں۔ جو غور وفکر کو لازم کرتی ہیں کورانہ تقلید کو قبیح ٹھیراتی ہیں، اور عقلوں پر سے پردے اٹھا دیتی ہیں۔

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ کئی صدیوں تک فکر بشری اور مغربی ملتوں کے درمیان کیسی سخت نزاع اور باہم اکھیڑ پچھاڑ رہی ہے، تاآنکہ آخر کار عقل کے غالب آجانے اور حریت فکر کے فتحیاب ہوجانے کے آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ ہم نے "آثار پیدا ہوگئے ہیں" اس لئے کہا کہ اب بھی ہم کو یورپ کے بعض ممالک بلکہ امریکہ کی دنیائے جدید میں ایسے لوگوں کی کمی نظر نہیں آتی جو قدیم تقالید کی حمایت کرنے اہل

اور جو کچھ ان کے باپ دادا کے اعتقادات تھے ان پر جمے رہنے پر اڑے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ تقالید اور اعتقادات عینی مشہودات سے معارض اور منطقی حجتوں سے متناقض ہی کیوں نہوں کیا آپ بھول گئے کہ گذشتہ سال ہی امریکہ کی ایک جامعہ نے اپنے پروفیسروں میں سے ایک نامور پروفیسر کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ جب اس نے ڈاروِن کے مذہب کی ترویج کی تو اس کے خلاف زبردست شور برپا ہوگیا اور وہ اس وقت تک فرو نہ ہوا جب تک کہ اس پروفیسر کو اس جامعہ کی کرسی سے الگ نہ کردیا گیا۔

حضرات!

جہاں تک ممالک غربیہ کا تعلق ہے یہ مختصر بیان ان حالات کی تصویر کھینچنے کے لئے کافی ہے جو گذشتہ کئی صدیوں کے دوران میں عقل بشری کو پیش آئے ہیں اور ان آلام و مصائب کا اندازہ کرنے کے لئے یہ تھوڑا سا خلاصہ ہی کافی ہے جن کا مقابلہ عقل کو اپنی حریت اور اپنے استقلال کی خاطر ممالک مغربی میں کرنا پڑا ہے آئیے اب ہم ایک اچٹتی ہوئی نظر مشرق پر بھی ڈال کر دیکھیں کہ جس وقت ممالک یونانیہ میں حریت فکر کی پو پھٹ رہی تھی (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کے اطراف) اس وقت بلاد مشرق میں عقل کا کیا حال تھا۔ جب مشرق ادنیٰ میں اکسینوفانیس (Xenophanes) یونانیوں کے دیوتاؤں پر طعن و تشنیع کی بوچھار کرکے اور ان کا مذاق اڑاکر لوگوں کو ان کی عبادت ترک کرنے کے لئے دعوت دے رہا تھا۔ اور جس زمانہ میں ہرقلیتس اور دیموقریتوس عقول بشری کو تقلید جاہلی کی بندشوں سے نجات دلانے کی کوشش کررہے تھے، اور ان کو ملکوت ارض و سما پر غور کرنے کی تعلیم دے رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں ہمکو مشرق کے دوسرے کنارے پر ایسی عقلی و نفسی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں جس کا مقصد سوئی ہوئی ہمتوں کو بیدار کرنا اور جاہل و گمراہ قوموں کو غور و فکر کی راہ دکھانا، اور ان کو اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل کی بحث و تحقیق پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں بودھ اپنی تعلیمات کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور چین میں کنفیوشس اس تفاوت طبقات اور اس سیاسی و اجتماعی فوضویت کے خلاف جنگ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں اس کے زمانے کی چینی قوم اور ملک چین کے ارباب حکومت

مبتلا تھے، اور اس سنگ دلی اور درشت خوئی، جور و ظلم اور استعباد کی اصلاح کرتا نظر آتا ہے جو اس کے عہد میں امرا کی امتیازی صفات تھیں۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مشرق کے یہ دونوں علاقے اپنے زمانۂ نہضت میں متحد اور اس نہضت کی کنہ و طبیعت میں متشابہ ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں اس کی توجہ، عام مادی احوال کے بجائے زیادہ تر نفس کو اخلاق فاسدہ کی نجاستوں سے پاک کرنے کی طرف مائل رہی ہے۔ اور چین میں کنفیوشسی نہضت کا مقصد اولین یہ رہا ہے کہ حیات سیاسی و اجتماعی اور مظاہر مادی کو منضبط کرنے کے لئے دستور مقرر کئے جائیں اور ان کو ایک نظم کے تحت لایا جائے۔

بزرگو! جس طرح شرق ادنی اور بلاد غربیہ میں مذہبی پیشوائی کے مدعیوں نے ان بدعات و مظالم اور ان ناروا بندشوں اور عبادت کے ان غلط طریقوں کو رواج دیا جنہوں نے خدا کے بندوں کو تکلیف میں ڈالا اور ارواح بشری کو ہلاکت کے گڑھے میں پھینکا، اور عقول انسانی کو غلامی کی قیود میں جکڑا، اسی طرح چین اور ہندوستان اور دوسرے ہمسایہ ممالک میں بھی ان کے ہم پیشہ لوگوں نے یہی سب حرکات کیں۔ اور ان کی بدولت قرون وسطی دنیا کی تاریخ میں بدترین قرون بن گئیں۔ آخر کار علیم حکیم کی حکمت اور رفیق رحیم کی رحمت اس کی مقتضی ہوئی کہ اپنے ظلمت و ضلالت میں بھٹکنے والے اور جہالت کی وادیوں میں حیران و سرگردان پھرنے والے بندوں پر نور معرفت کا اشراق فرمائے کہ ان کی عقلوں کے بند کھل جائیں، اور ان کے نفوس کی منزلت بلند ہو جائے اس نے انہیں محض ناکام تجربوں کی رہنمائی پر نہ چھوڑ دیا بلکہ ان کو رہائی دلانے اور راہ راست دکھانے کے لئے وحی نازل فرمائی تاکہ وہ ان مجادلات اور مصادمات سے بچ جائیں جس میں دوسری ملتوں اور مذاہب کے لاکھوں طالبان حریت و عدل و مساوات فنا ہو چکے تھے۔ اس کی حکمت نے یہ چاہا اور اسی لئے اس نے قرآن کو دین فطرت کے ساتھ بھیجا تاکہ قید و بند میں جکڑے ہوئے نفوس کو اس کے پاک احکام کے ذریعہ سے آزاد کرائے، اور گمراہ عقلوں کو جہالت کے مہالک سے

نجات دلائے۔

اب میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں اس سے آپ حضرات کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ قرآن کریم نے کس طرح حریت کی راہ میں فکر بشری کی ہدایت فرمائی ہے اور وہ عقل کو کن بلند منزلوں تک اٹھائے گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مناسب ہوگا کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس سوال کو بھی حل کر دیں جو بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب قرآن کا دین دراصل دین فطرت ہی ہے، اور جب احکام کی صحت کا مقیاس، قرآن کے نزدیک عقل اور منطق ہی ہے تو پھر دین کے بذریعہ وحی نازل فرمانے کا کیا فائدہ ہے؟ کیوں عقل بشری کو حق اور حقائق کی راہ میں مجاہدہ کرنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا جائے تا کہ وہ خود ان تک پہنچے اور خیر و شر اور نافع و ضار کی بحث و تنقیب کر کے خود ان کی کنہ کو سمجھے اور ان کے حدود کا ادراک کرے اور ان کے درمیان جو ما بہ الفرق و امتیاز امور ہیں ان کو پہچانے؟

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ بلاشبہ انسانی عقل کے لئے یہ ممکن ہے کہ بحث و تنقیب اور تجربوں کے ذریعہ سے احکام اور تصورات اور نظم اجتماعی اور مسائل علمی اور آداب خلقی کے ان مراتب کمال تک پہنچ سکے جن کے لئے نفس انسانی ایک فطری شوق رکھتا ہے لیکن اس راہ میں دو سخت گھاٹیاں ہیں جن کو عبور کئے بغیر اس آرزو کا تحقق نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک عادی ہے اور دوسری طبعی۔

پہلی گھاٹی یہ ہے کہ نفس بشری اپنی حقیقی مصلحت کی خاطر جن وجوہ صواب کی جستجو کرتا ہے ان تک پہنچنے کے لئے صدیوں کے تجارب اور تحقیقات درکار ہیں۔

دوسری گھاٹی ناموس نشو و ارتقا یعنی تدریجی ترقی کی گھاٹی ہے، جس کی وجہ سے عالم معقولات و معنویات میں عقل بشری کسی آگے کے مرحلہ پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ اس سے پہلے کے مراحل کو قطع نہ کرے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو تحقیق و بحث کی راہ میں عقل کی پیشقدمی کو روکتے ہیں

اور اکثر ایسی رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں جن سے بچ کر بہت ہی کم عقلیں نکل سکتی ہیں ورنہ اکثر و بیشتر تو ٹھوکر کھا کر گر ہی پڑتی ہیں۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ اہم عامل وہ نفسی انفعالات اور عصبی اضطرابات ہیں جن کے آثار ہماری اجتماعی اور عقلی اور ادبی زندگی کے شعبوں میں اتنے نمایاں ہیں کہ کوئی شخص ان سے ناواقف نہیں ہے۔ یہ بڑی سخت مغالطہ ہوگا۔ اگر ہم اپنے افکار اور احکام اور میلانات میں کمال کو پہنچے اور نقائص سے بری ہونے کا ادعا کریں۔ دراں حالیکہ ہمارے اندر ایک نفس امّارہ، اور ہمارے پہلو میں ایک متلوّن قلب موجود ہے اور ہم اکثر معاملات میں اپنی خواہشات کی اطاعت اور ہوا و ہوس کی پیروی کیا کرتے ہیں۔

ان وجوہ سے اور اس لئے کہ لوگوں کو سب سے قریب کے اور سب سے زیادہ سیدھے اور سب سے زیادہ محفوظ راستے پر چلایا جائے، خالق کائنات اپنی مخلوقات میں سے پاکیزہ ترین مخلوق کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجتا ہے کیونکہ اپنے بندوں پر اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لغزش قدم، اور پریشان خوابی اور خواہشات کے فتنے سے ان کو بچائے اور ان کے سینکڑوں ہزاروں برس اس علم اس حریت و مساوات، اس عدل اور ان تمام فضائل و کمالات کی تلاش و جستجو میں ضائع نہ ہونے دے جن کے لئے ان کے نفوس فطرۃً آرزومند ہیں۔

قرآن حکیم ہر چیز میں دین فطرت لے کر آیا ہے۔ اس کے قواعد احکام اور اصولِ آداب و شرائع پوری طرح فطرت بشری کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس کی لائی ہوئی شریعت کے امہات اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو امور مؤثرات کی تاثیر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور جن میں اختلاف حالات کے ساتھ پے در پے تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قوم کے عرف کا لحاظ کیا جائیگا۔ اس وجہ سے زمان و مکان کے اختلافات اور مختلف اقوام کے مخصوص عرف کے لحاظ سے شریعت کے فرعی و جزئی مسائل میں اختلاف ہوتا رہتا ہے اس طرح قرآن مجید مطالب عقل کے عین مطابق ہے اور انسانی فطرت سے ناآشنا نہیں ہے اور حیات اجتماعی کے شعبوں میں سے کسی شعبہ میں طبیعت بشری کے سلطان و آثار سے تجاہل نہیں برتتا۔

پھر قرآن اس سے خوب واقف ہے کہ انسان اپنے احساس وشعور کی ابتدائی حالت ہی سے ان واقعات وحالات کی علتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جن کا ادراک اسے اپنے حواس کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ تلاش وجستجو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے وہ اس کی اس فطرت کو اور زیادہ ابھارتا اور اسے بحث وتحقیق کے نئے گوشے دکھاتا ہے۔ اور بار بار ان جامد اور ٹھس لوگوں کو تنبیہ کرتا رہتا ہے جو تقلید کے تنگ دائروں میں اس قدر مقید ہو گئے ہیں کہ ان سے نکل کر وسعت نظر کے ساتھ کائنات اور اس کی خلقت پر نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ اس باب میں قرآن مجید نے تدبر وتفکر کی دعوت دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا ہے اور کوئی حجت اور کوئی برہان ایسی نہیں چھوڑی ہے جو اس نے حریفان حق پر قائم نہ کی ہو۔

اور یہ جو قرآن نے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور اس کے ساتھ ان احکام وشرائع اور آداب وفضائل کو قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو انبیاء نے پہونچائے ہیں، تو یہ ہرگز عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل جس طرح فطرۃً اس چیز کی حاجت کا شعور رکھتی ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد اور جماعتوں کے ظلم وتعدی کو افراد اور جماعتوں ہی کے ذریعہ سے رفع کیا جاتا رہے (وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ ۲: ۲۵۱) اسی طرح اس کی فطرت ہی اسے اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ ہر چیز قبول یا وضع کرے جس میں اس کو نظام حیات اجتماعیہ کی بہتری نظر آئے۔ اور چونکہ انسانی عقل، تشریعی ادبی اور علمی شعبوں کے معالجہ میں، نارسائی، لغزش اور قلت وسائل کے خطرات سے دوچار ہے۔ (جس کی تفصیل ایک دوسرے موقع پر بیان ہو چکی ہے) اس لئے وہ طبعاً اس طرف مائل ہے کہ کسی پر بھروسہ اور اعتماد کر کے اطمینان وسکون حاصل کرے، اور کسی ایسی بات کو قبول کرے جس کے بعد اس کو بحث وتنقیب کی مشقت نہ اٹھانی پڑے، اور کسی ایسے ماہر کامل کو اپنا رہنما بنالے جو اس کو ظنون اور تجربات کی راہ میں پیش آنے والے خطرات ومہالک سے بچالے جائے۔ پھر اس اعتماد وقبول کے لئے اس ہستی کی نازل کی ہوئی وحی سے زیادہ مستحق اور کیا چیز ہو گی جو انسان کی فطرت وطبیعت کے تمام اسرار پر محیط اور ان سب امور کا عالم ہے

جن میں اس کی صلاح شان و سعادت مضمر ہے؟ مزید برآں انسان فطرۃً اپنے مطلوبات تک پہنچنے کے لئے سب سے قریب کا راستہ چاہتا ہے۔ اور یہی خواہش اس کو کسی ایسے رہنما کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے جس پر وہ اعتماد کر سکے، اور جس کی ہدایات پر وہ اطمینان و سکون نفس کے ساتھ چل سکے پس نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی جس کثرت کے ساتھ بعض افراد انسانی پر اعتقاد رکھنے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور انبیاء و رسل اور ان کے پیرو داعیوں پر ایمان لاتے ہیں، اس کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ ان کی رہنمائی سے بہ آسانی منازل کمال تک پہنچنے اور ان کی ہدایت سے سعادت و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ انسان طبعاً اس ایمان و اعتقاد کی طرف مائل ہے، اس لئے کہ وہ فضائل کی معرفت میں درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے گھبراتا ہے! اس نے دیکھا کہ اس قسم کی تدریجی طلب کرنے والا اسا اوقات صواب کی منزل تک نہیں پہنچا، اور اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ سلامتی کے ساتھ اس راہ سے گذر جائیگا۔ وہ متفرق اعمال اور تصرفات اور احکام کے برے عواقب میں پڑنے سے فطرۃً بچنا چاہتا ہے، اس لئے اس کی فطرت ہی اس کو ان نجات کی خوشخبری دینے والے اور ان عذاب سے ڈرانے والے داعیوں کی دعوت قبول کرنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اسے امید دلاتی ہے کہ اس کا مطلوب گم کردہ جس کو اگر وہ خود اپنی کوشش سے طلب کرے تو شاید نہ پا سکے، غالباً اس طریقہ سے مل جائے گا جس کی طرف وہ لوگ دعوت دے رہے ہیں۔

پس انسان کی فطرت سلیمہ اور اس کی آزاد عقل ہی اسے ایک ایسے ھادی اور رہنما پر اعتقاد رکھنے اور مطمئن ہو جانے کے لئے آمادہ کرتی ہے جو اسے خطار اور لغزش اور گمراہی سے بچا کر سلامتی کی راہ پر لیجانے والا ہو۔ اور اسے خوف دلاتی ہے کہ اگر اس نے خود اپنے دلائل اور خود اپنی قوتوں پر اعتماد کیا تو اغلب ہے کہ کہیں نا واقفیت، اور فکر کی غلطی اور قدم کی لغزش کی بدولت وہ ان بہت سے اعلیٰ مطالب اور پاکیزہ رغائب تک نہ پہنچ سکے گا جن تک پہنچنے کی خواہش اس کے نفس میں پنہاں ہے۔ اسی فطرت کے اقتضا سے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، تہذیب نفس و تہذیب عمل پھیلانے والی جمعیتیں بنائی جاتی ہیں، اور مذہبی پیشواؤں اور صوفیوں

کی طرف ہر زمانے میں ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ رجوع کرتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عقل کو حرکت میں لانے اور فکر کو آزاد کرنے کا کوئی وسیلہ ایسا نہیں ہے جس کو قرآن مجید نے اختیار نہ کیا ہو۔ وہ جب کسی پر فیصلہ چھوڑتا ہے تو وہ عقل ہی ہوتی ہے، اور جب کوئی حجت قائم کرتا ہے تو حکم عقلی ہی کی بنا پر کرتا ہے اور جب کسی پر اظہار غضب کرتا ہے تو عقل کو معطل کر دینے والے ہی پر کرتا ہے۔ اور جب کسی سے اظہار خوشنودی کرتا ہے تو وہ ارباب عقل و خرد ہی ہوتے ہیں۔ قرآن نے جہاں کہیں دوسری ملتوں اور مذاہب کے پیروؤں اور مادیین و دہریین سے مجادلہ کیا ہے، وہاں وہ برہان ہی ان پر ضرب لگاتا ہے۔ اور بحث و نظر ہی کی طرف انھیں دعوت دیتا ہے، وہ کہتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۲۲)

وہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں۔ مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ وہ کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی دراصل غافل ہیں۔

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن نے ان گمراہوں کو اس بنا پر زجر و توبیخ کی ہے کہ انہوں نے اپنی عقلوں کو بیکار کر دیا ہے۔ یا باپ دادا کی تقلید میں اتنا مقید کر دیا ہے کہ اگر آبائی طریقوں سے ہٹ کے کوئی طریقہ پیش کیا جائے تو وہ اس کو محض اس بناء پر رد کر دیں کہ ان کے باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲: ۲۱)

اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی پیروی اختیار کرو تو انہوں نے کہدیا کہ نہیں ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ انہی کی پیروی کیے جائیں گے

اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر رہے ہوں۔

اور جن آیات میں اپنی عقلوں سے کام نہ لینے والوں اور اندھے مقلدوں کی مخالفت کیگئی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۚ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷: ۴)	اور جس بات کا تجھ کو علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر یقین رکھ کہ کان آنکھ اور دل سب سے قیامت کے دن پوچھ گچھ ہوگی۔

اور:۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸: ۳)	اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

اور:۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۰: ۵)	اور ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو تیری طرف نظر لگائے بیٹھے ہیں تو کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا چاہے ان کو کچھ نہ سجھائی دیتا ہو۔

پھر تم دیکھو گے کہ جہاں کہیں حریفان حق سے مجادلہ کیا گیا ہے وہاں ہر آیت کے ختم پر اس طرح کے فقرے استعمال کئے گئے ہیں (بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو علم نہیں رکھتے)۔ (قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (وہ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں) هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (اپنی برہان پیش کرو اگر تم سچے ہو)۔ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (وہ کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہیں) لَوْ تَشْعُرُوْنَ (کاش تم شعور رکھتے)۔ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ (کیا وہ سنتے ہی نہیں) اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سبق صرف اہل عقل و خرد ہی حاصل کرتے ہیں)۔

قرآن کریم نے جہاں کہیں اپنے پیش کردہ دین کے اقتضا کے مطابق کوئی بات پیش کی ہے وہاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھایا ہے۔ اور جب ارکان دین میں سے کسی رکن اور عقائد میں سے کسی عقیدہ کی طرف دعوت دی ہے تو اس میں ایسی باتوں سے پرہیز کیا ہے جن کا انسانی عقل احاطہ نہیں کر سکتی اور جن کے ادراک سے بشری فہم عاجز ہے۔ اور جب اصول دین میں سے کسی اصل کی تلقین کی ہے تو مقدمات نظری سے ابتدا کی ہے اور پھر کفر و عناد کی بنا پر اس سے انکار کرنے کے انجام سے ڈرایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَا مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸: ۵)	تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے

اور ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ (۲۳: ۴)	تاکہ لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

قرآن کا نازل فرمانے والا جلیل الحکمت خدا، جو انسان کا خالق اور دلوں اور کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اپنی آیات میں اپنے آپ کو کمال مطلق کی مثال ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جس کا اظہار اس کے اسمائے حسنیٰ سے ہوتا ہے مثلاً عدل اور حق اور خیر وغیرہ۔ اس بنا پر اس نے اپنے رسول کو جبار اور کوتوال بنا کر نہیں بھیجا بلکہ خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۔ (۸۸)	اے پیغمبر تو لوگوں کو سمجھا کیونکہ تو فقط سمجھانے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔
فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۔ (۵: ۱۶)	تو کیا پیغمبروں پر اس سے زیادہ بھی کوئی ذمہ داری ہے کہ صاف صاف احکام الٰہی پہنچا دیں۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰:۱۰)

کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ مومن بن جائیں؟

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ (۱۸:۸)

اور ہم تو پیغمبروں کو صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ نیکوں کو نجات کا مژدہ سنائیں اور بدوں کو عذاب سے ڈرائیں وہ باطل کے بل بُوتے پر جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو متزلزل کر دیں۔

وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰:۳)

اور تو ان پر حاکم جابر نہیں ہے۔ تو تو بس ہر اس شخص کو قرآن کے ذریعہ سے سمجھا دے جو میرے عذاب سے ڈرتا ہے۔

پہلی چیز جس کے لئے قرآن نے عقل کو حکم بنایا ہے وہ خدا کے وجود پر ایمان ہے نہ صرف قرآن بلکہ اس کے سوا علمائے کلام و اصول دین بھی سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس عقیدہ کی طلب طریق نظر و استدلال سے ہونی چاہیئے حتّٰی کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ پر تقلیدی ایمان لانے کو قبول ہی نہیں کیا ہے۔ اور اگر امام غزالی وغیرہ نے ایمان تقلیدی کو قبول بھی کیا ہے تو وہ عوام کے لئے ایک رعایت ہے کہ وہ بحث و نظر کی استطاعت نہیں رکھتے، اور اس کے وسائل سے ناواقف ہیں یا ان کے قوائے ادراکیہ اتنے قوی نہیں ہیں کہ بحث و نظر کی شرائط پوری کر سکیں۔ اس بنا پر ان سے ایمان ثابت قبول کر لیا گیا ہے لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کی کوئی سورت آپ کو ایسی نہیں ملے گی جس میں اس نے انسان کو بحث و نظر اور تعقل و تفکر کی دعوت نہ دی ہو۔ اس جگہ ان سب آیات کا استیعاب ممکن نہیں ہے۔ صرف چند آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا

جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي اللَّيْلَ
النَّهَارَ - إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ - وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجٰوِرٰتٌ
وَجَنّٰتٌ مِنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ
صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقٰى بِمَاءٍ
وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ
فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذٰلِكَ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ
يَعْقِلُونَ (۱۳:۱)

کیں اور وہی رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے یقیناً
اس میں غور کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔
اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعے ہوتے ہیں جن
میں انگور کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت دو شاخے
اور اکہرے، سب ہی کچھ ہوتے ہیں حالانکہ سب کو ایک ہی
پانی سے سیراب کیا جاتا ہے پھر بھی بعض کو بعض پر پھلوں
میں برتری دیتے ہیں۔ یقیناً ارباب عقل کے لئے اس میں
بہت سی نشانیاں ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي
فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ
كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ
لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (۲ : ۲۰)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات دن
کے اختلاف اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی
چیزیں لئے ہوئے سمندر میں چلتی ہیں، اور اس پانی میں
جسے اللہ آسمان سے نازل کرتا اور اس کے ذریعہ سے
زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کر دیتا ہے
اور پھر اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں
کی گردش اور زمین و آسمان کے درمیان گھرے ہوئے
بادلوں میں، ارباب عقل کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ
وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَإِلَى الْأَرْضِ
كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸)

کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے اور
آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں
کو نہیں دیکھتے کہ کیسے نصب کئے گئے ہیں۔ اور زمین کو نہیں
دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔

وَ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱ : ۱) اور خود تمہارے اندر کیسی نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو
سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ہم ان کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے اپنے
حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱ : ۶) . اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو
جائے کہ یہ قرآن برحق ہے۔
اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ کیا انہوں نے آسمان وزمین کے انتظام اور خدا کی پیدا
وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ (۷ : ۲۳) کی ہوئی کسی چیز پر بھی نظر نہیں کی۔

معزز حاضرین! یہاں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ اس باب میں جتنی آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان سب کا استقصار کیا جائے۔ اس لئے ہم صرف انہی اقتباسات پر اکتفا کر کے ایک دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہیں جس میں اکثر بحث کرنے والوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کیا جائے گا جس نے بحث و نظر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس کے باوجود وہ دین میں عقیدۂ حق تک نہ پہنچ سکا اس مسئلہ میں علماء نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ مگر میں یہاں ان کی بحثوں سے تعرض نہ کرونگا اور خود قرآن مجید سے استفسار کرونگا کہ ایسے شخص کے متعلق وہ کیا کہتا ہے۔

قبل اس کے کہ اس بارے میں قرآن مجید سے استفسار کیا جائے، میں چاہتا ہوں کہ آپ چند مسلّمات ذہن نشین کرلیں:۔

ایک یہ کہ جب کسی حکم پر دلیل صحیح قائم ہو جائے تو عقل بشری اس میں شک کرنے پر قادر نہیں ہے
دوسرے یہ کہ عقل بشری میں یہ قدرت نہیں ہے کہ دو متناقض امور کے معاً صحیح ہونے کو جائز رکھے
تیسرے یہ کہ جب دو حکم متعارض ہوں اور ان میں سے ایک حکم کی تائید میں قاطع حجتیں موجود ہوں تو عقل کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو قبول کرے
دین فطرت نے ان تینوں فطری قضایا کو ملاحظہ کیا ہے اور اس کی آسمانی کتاب نے انکی

تصدیق کی ہے۔ پھر اس کے بعد علما نے اس کی تائید کی ہے اور باوجود فرعی مسائل میں مختلف ہونے کے، ان سب نے اس قاعدہ کلیہ کو تسلیم کیا ہے کہ شرعیات میں سے جو چیز بھی بظاہر خلاف عقل معلوم ہو۔ اس کی تاویل اس طرح کی جائے کہ وہ حکم عقل کے مطابق ہو جائے۔ کیا یہ مسلمات عقلیہ کے حدود پر تفسیراً و فطرت بشریہ کے حکم پر نزول نہیں ہے؟ اور کیا اس قاعدہ کے باوجود عقائد میں جبر اور زبردستی ہو سکتی ہے؟ اور کیا دین فطرت جو دین بحث و نظر ہے ان لوگوں کو کسی عقیدہ پر مجبور کر سکتا ہے جن کی عقلیں اس عقیدہ کے ادراک سے قاصر ہوں، یا جن پر شکوک و شبہات کا اتنا ہجوم ہو کہ وہ ان کو دور کرنے اور انھیں روکنے سے عاجز رہ گئے ہوں؟ اور کیا وہ دین جبر اور زبردستی کا قائل ہو سکتا ہے جس نے غیر معقولات پر ایمان لانے کی سخت مخالفت کی ہے، اور جس نے ایسے ایمان کے مقابلے میں اُس یقینی عقیدۂ ایمان کی بنیاد ہی قائم کی ہے جو طریق عقل و نظر سے حاصل ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا عدل اس سے بالاتر ہے کہ وہ لوگوں کو اس چیز کی تکلیف دے جس کی ان میں طاقت نہ ہو، یا ایسی چیزوں پر ایمان لانا ان پر لازم کرے جن کی طرف حجت اور برھان ان کی ہدایت نہ کرتی ہو۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور کرنے سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۲۳) — تاکہ پیغمبروں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

اب ہم قرآن کریم کی ان آیات میں سے بعض کو پیش کرتے ہیں جو اس مقام سے مناسبت رکھتی ہیں:

قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِۦ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَٰرِهُونَ (۱۱: ۳۰) — نوح نے کہا کہ اے میری قوم۔ کیا تم نے غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے رستے پر ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھکو رحمت عطا فرمائی ہے۔ پھر وہ رستہ تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو کیا ہم تمھیں زبردستی

اس پر چلائیں گے درانحالیکہ تم اس کو ناپسند کرتے ہو؟

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ۔ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (۵۰ : ۳) — ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں تم ان پر کوئی حاکم جابر تو ہو نہیں۔ جو کوئی میری وعید سے ڈرے اس کو بس تم قرآن کے ذریعہ سے سمجھا دو۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (۲:۱۴) — ہم نے ان لوگوں کے لئے آیات واضح کردی ہیں جو یقین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ہم نے تم کو دین حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخیوں کی بازپرس نہ ہوگی۔

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲ : ۵) — تم پر خدا کا پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کچھ ذمہ داری نہیں ہے

اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْرٌ (۱۱:۲) — تم تو بس عذاب خدا سے ڈرا دینے والے ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن جو دین فطرت کی کتاب ہے ہرگز ایسی کوئی بات پیش نہیں کرتا جو درست اور صحیح آراء کے منافی ہو یا جس کی حکمت عقول سلیمہ سے پوشیدہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان کی عقل کو ایسی باتوں پر ایمان لانے کی تکلیف نہیں دیتا جو غیر معقول ہوں۔ اور وہ ہرگز انسان کے جسم کو اس بار کے برداشت کرنے پر مجبور نہیں کرتا جسکو اٹھانے کی اسمیں طاقت نہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان پر ایسا کوئی فرض عائد نہیں کرتا جو اس کی فطرت کی وسعت میں نہ سماتا ہو۔ اس کا اصلی کام تو یہی ہے کہ وہ نوع بشری کو ہدایت کا قریب ترین راستہ دکھائے۔ اور خدا کے بندوں کو ہلاکت کے ان گڑھوں سے بچا کر نکال لے جائے جو طریق وحی کے بجائے طریق تجربہ سے حق اور حقیقت کی تلاش کرنے والوں کی راہ میں پیش آتے ہیں اور ان شیاطین انس ان ظالم حکام، ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں سے محفوظ رکھے جو حق کے راستہ میں رہزنی کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں جتنے شواہد و دلائل آپ چاہیں وہ آپ کو مل سکتے ہیں دیکھئے کہ طلاق اور

تحریم شراب اور تحریم قمار کے معاملہ میں مغربی قوموں کی عزیمت کیسے تلخ تجربوں اور کتنی مدتوں کے بعد درست ہوئی ہے[1]؟ اور کیسے شدید مقابلوں اور کتنی طویل صدیوں کے بعد ان میں عقل کو آزادی نصیب ہوئی، اور حریت فکر اور حریت اظہار رائے کو مباح تسلیم کیا گیا، اور انسان کے ابتدائی فطری حقوق تسلیم کئے گئے[2]؟ دینی اور سیاسی شورشوں کی تاریخ سے پوچھو، وہ تمھیں بتائیگی کہ کتنے خون اس سلسلہ میں بہائے گئے اور کتنی جانیں اس راہ میں ہلاک کی گئیں؟ اس سے دریافت کرو، وہ تمہیں ان ہنگاموں کے مصائب و آلام کی ہولناک داستان سنائے گی اور ان کلفتوں کا حال بیان کریگی جن سے قوموں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

اس کے بعد مجھ کو مسئلہ ارتداد سے بحث کرنی ہے جو بہت بسط و تفصیل چاہتی ہے۔ اس لئے تنگی وقت کی بنا پر اس کو دوسرے اجتماع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں دو اہم مسائل پر اور بھی کلام کروں گا۔

۱۔ دین فطرت کی کتاب ہونے کے اعتبار سے معجزات اور خوارق کے باب میں قرآن کریم کا موقف

۲۔ ناموس نشو و ارتقار اور اس کے قوانین کی تنقیح ان دلائل کے مقابلہ میں جو قرآن نے قائم کئے ہیں، اور وجود خالق پر استدلال کرتے ہوئے جن میں نظر کرنے کی طرف اس نے دعوت دی ہے۔

پھر میں تکلیف عینی اور حریت ضمیر انفرادی کے متعلق قرآن کا مسلک مختصر طور پر بیان کر کے ختم کرونگا۔

---

[1] بلکہ حقیقۃً اب بھی درست نہیں ہوئی۔ مترجم۔

[2] یہ خواب بھی ابھی تک محروم تعبیر ہے خلیب مرحوم کی وفات کے بعد یورپ میں جو انقلابات پیش آئے ہیں وہ پھر اس پچھلے دور استبداد و قہر کی جانب رجعت کا اظہار کر رہے ہیں۔ مترجم۔

تذاکرۂ علمیہ

مسئلہ جبر و قدر

جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز (ہوم ڈپارٹمنٹ شملہ) نے اپنے ایک عنایت نامہ میں ان اعتراضات کی طرف توجہ دلائی ہے جو مسئلۂ جبر و قدر کے متعلق قرآن مجید کی بظاہر متناقض و متعارض آیات پر کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ مسئلہ غایت درجہ مشکل اور پیچیدہ ہے اور اس کے حل میں بڑی دقتیں ہیں لیکن اس کی جہت سے آیات قرآنی پر جو شبہات و اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ بھی اتنے اہم ہیں کہ نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ اعتراضات حسب ذیل ہیں:۔

انسان کا مکلّف بہ جزاو سزا ہونا ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ اعمال و افعال اسکے ارادہ و نیت کے تابع ہوں اور اس ارادہ و نیت پر کسی اور طاقت کا تصرف نہ ہو قرآن حکیم کی ساری تعلیم کا لب لباب یہی ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دے کر باز پرس کا مستوجب ٹھیرایا جائے۔ ضلالت و ہدایت، عذاب و ثواب، نکبت و ثروت، مصیبت و راحت، غرض کہ دنیا و آخرت کی میزان کے دونوں پلڑے قدرتی نتائج ہوں اس کے اپنے اعمال کے اور یہ نتائج مرتب ہوں کسی خاص قاعدہ کلیّہ کے ماتحت لیکن قرآن مجید کی بعض آیات سے ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ انسانی ارادہ خود مشیت ایزدی کا تابع ہے مثلاً ضلالت و ہدایت کے متعلق ایک طرف تو ایسی کھلی کھلی اور واضح آیات موجود ہیں کہ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ——— وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ——— وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ——— فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ——— لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ———جن سے نور و ظلمت، ایمان و کفر ہدایت و ضلالت کی

راہوں کا اختیار کرنا انسان کے اپنے ارادوں اور مساعی کے ماتحت قرار دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ایسی آیات مثلاً۔ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ (ابراہیم) مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (انعام) بھی ہیں جن میں ان چیزوں کو مشیت ایزدی کے تابع بتایا گیا ہے۔ سورۂ مدثر میں جہاں فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ۔ اور سورہ تکویر میں اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا کہکر قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کیلئے انسانی ارادہ کو اختیار دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آیات وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ سے اس ارادہ کو مشیت باری تعالیٰ کے ماتحت قرار دے کر سلب کر دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر جگہ گمراہی کے لئے یہ اصول قائم کر دیا ہے وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ۔ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ۔ اور ہدایت کے لئے بھی ایسی شرائط بیان فرمادی ہیں کہ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔ اور اسی قبیل سے اور متعدد آیات قرآنی ہیں، لیکن ان کے ساتھ ہی ایسی آیات بھی تو ہیں جن میں بغیر کسی شرائط و قیود کے ضلالت وگمراہی کو مشیت باری تعالیٰ یا فضل ایزدی کے تابع رکھا گیا ہے۔ مثلاً آیت محولہ صدر فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ اور وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وغیرہ۔

اسی طرح عذاب و مغفرت کے بارے میں جہاں ایک طرف صاف و بیّن اصول مقرر فرما کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ الآیہ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا۔ اور اس ضمن کی

کی متعدد آیات دوسری طرف یہی قرآن حکیم میں ہے کہ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ
یعنی عذاب و مغفرت بھی مشیت ایزدی کے تابع ہیں۔ مغفرت میں تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ارحم الراحمین
غافر الذنب۔ اپنی شان کریمی سے گنہ گار کو بخش دیگا۔ لیکن یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ کی یہ تاویل بھی مشکل ہے
زیادہ سے زیادہ یہ معنی لئے جا سکتے ہیں کہ گنہگاروں میں سے یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ
لیکن پوری آیۃ کا قرینہ اس کی طرف قوی دلالت نہیں کرتا۔

نکبت و ثروت کے لئے بھی قرآن حکیم میں اقوام گذشتہ کی تاریخی شہادتوں سے اس اصول
کی تائید کی گئی ہے کہ جاہ و اقبال ایمان و تقوٰی پاکباز زندگی اعمال صالح اور قانون فطرت کی پابندی کے ساتھ
لازم و ملزوم ہے اور اس کے خلاف چلنے سے ذلت و مسکنت، غضب آلہی کی شکل میں طاری ہو جاتی ہے چنانچہ ارشاد
ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔ یا اور متعدد آیات۔ لیکن دوسری طرف یہ آیات بھی قرآن شریف
میں ہیں۔ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ لِمَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔۔۔ وَاللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ، وغیرہ۔

اور مصیبت و راحت کے باب میں بھی کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا
كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۔۔۔ لیکن دوسری طرف یہ آیت بھی ہمارے سامنے ہے کہ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ
يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ لیکن كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ساتھ ہی دوسری آیۃ میں ہے کہ مَآ
اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (نساء) وغیرہ۔

قرآن حکیم کے بعد اگر ہم احادیث کی طرف آئیں تو بہت سی احادیث انسان کے مجبور
و مجبول ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً اذا سمعتم بجبل زال عن مکانه

فصد قوا بہ وَ اذا سمعتم برجل تغیر عن خلقہ فلاتصد قوا بہ فانہ یصیر علیٰ ماجبل علیہ ۔ اور اِن القلوب بین اصبعین من اصابع اللہ یقلبھا کیف یشاء ۔ یا ایک حدیث شریف میں ہے کہ لوگ مختلف مدارج میں پیدا کئے گئے ہیں ان میں بعض مسلمان پیدا کئے گئے ہیں .... الخ

میں نے اعتراضات مختصراً لیکن من وعن پیش کر دیے ہیں ۔ اس میں شبہ نہیں کہ تقدیر کا مسئلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا دنیا میں مذہب کا وجود ۔ اور ہے بھی کچھ لاینحل سا ہی ۔ ہر ایک مذہب نے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن افراط و تفریط میں ، ہندوستان و یونان میں اگر تناسخ کے چکر اور جنم لیکھا سے انسان کو کلیۃ مجبور محض بنا دیا گیا ہے ، تو ایران کے آتش کدوں میں خدا کو بھی معطل محض کر دیا گیا ۔ حکمائے فرنگ کے ایک فرقہ نے اگر خدائے خالق کو ایک گھڑی ساز کی طرح سمجھا کر جو ایک دفعہ گھڑی بنا دینے کے بعد اُسے اصول اور قاعدے کے تحت چھوڑ کر خود عضو معطل ہو جاتا ہے تو ہمارے ہاں کے جبریہ و قدریہ کی بحثیں بھی کچھ کم تشنۂ دہنیں ہیں ۔ یہ درست ہے کہ نظریہ کے لحاظ سے اس باب میں ایمان و عقل کے دونوں پلڑوں میں توازن مشکل ہو جاتا ہے لیکن اسے کما ہو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا ۔ ہر چند میرے نزدیک مسئلہ قضا و قدر جزو ایمان نہیں ہے اور اس کی حیثیت ایک مسئلہ کی ہے لیکن چونکہ قرآنی آیات میں بقول معترضین بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس لئے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے ۔

مسئلہ ہر چند بہت پرانا ہے اور اس پر مخالف و موافق بہت کچھ لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے لیکن چونکہ ۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ۔

اس لئے دور حاضر کے طرز استدلال و استنباط نتائج کے مطابق اس کے متعلق بھی گفتگو کی جانی ضروری ہے ،،

جہاں تک پیش کردہ سوال کا تعلق ہے، اس کے جواب میں صرف اسی قدر کافی ہو سکتا تھا کہ قرآن مجید کی آیات میں وجہ تطبیق و توفیق بیان کر کے اس تناقض کو رفع کر دیا جاتا جو بظاہر ان میں نظر آتا ہے لیکن اس وجہ تطبیق کے بیان میں بہت سے ایسے امور کی طرف اشارہ ناگزیر ہے جن کو ذرا تفصیل و تشریح کے ساتھ ذہن نشین کئے بغیر مدعا کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ارشادات پر بحث کرنے سے پہلے مسئلہ جبر و قدر کی اصلیت اور اس کے ما لہ و ما علیہ پر نظر ڈال لی جائے۔

اختیار و اضطرار کا ابتدائی فرق

ایک عامی بلا کسی غور و فکر کے محض وجدانی طور پر یہ تصور رکھتا ہے کہ انسان اپنی ارادی حرکات و سکنات میں آزاد ہے، ہر ایک فعل وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، اپنے ایسے تمام افعال کے لیے وہی ذمہ دار و جواب دہ ہے۔ اچھے افعال کے لیے مدح و تحسین اور جزا و انعام کا مستحق ہے، اور برے افعال کے لئے ذم اور سزا کا مستوجب۔ اس سادہ اور وجدانی تصور میں کہیں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے سوچے سمجھے افعال میں کسی خارجی یا باطنی قوت سے مقہور و مجبور ہے اور جہاں ظاہر حال کو دیکھتے ہوئے مقہوری و مجبوری کے آثار نظر آتے ہیں وہاں ارادہ و اختیار کے بجائے اضطرار اور بے اختیاری کا حکم لگا دیا جاتا ہے، انسان کی ذمہ داری اور جوابدہی ختم ہو جاتی ہے، مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق باقی نہیں رہتا، اور ایسے حالات کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان پر انسان کے نیک یا بد اور اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو پتھر مارے یا گالی دے تو اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس نے یہ فعل کسی اور طاقت کے جبر سے کیا ہے، بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے قصداً مجھے تکلیف پہنچانے کے لئے ایسا کیا ہے اور اس لئے وہ اس کو ذمہ دار قرار دے کر جواب میں گالی یا پتھر سے اس کی تواضع کرتا ہے لیکن اگر وہی شخص دیوانہ ہو تو اس کی گالی یا اس کے پتھر کو کوئی بھی قصد و اختیار پر محمول نہ کرے گا، بلکہ اسے مجبور و مضطر قرار دے کر تمام افعال کی ذمہ داری سے بری سمجھے گا۔

یہی اضطراری اور اختیاری، ارادی اور تسخیری اعمال کا فرق، جس کا تصور اولی طور پر

ہمارے ذہن میں موجود ہے، اُس معیار کا مبنیٰ و اساس ہے جو ہم نے انسان کے نیک اور بد ہونے اور اس کے قابل جزا یا مستوجب سزا ہونے کے لئے قائم کیا ہے۔ ہم ایک بچے یا ایک پاگل کو اس کے برہنہ پھرنے پر کبھی ملامت نہیں کرتے۔ مگر ایک عاقل و بالغ آدمی بحالت عریانی باہر نکل آئے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کسی شخص کا منہ قدرتی طور پر خراب ہو تو کوئی اسے دیکھ کر بُرا نہیں مانتا لیکن اچھے خاصے منہ والا اگر ہمیں دیکھکر منہ چڑائے تو ہمیں ناگوار ہوتا ہے۔ بخار کا مریض حالت بحران میں لایعنی باتیں بکتا ہے اور ہم اس پر کچھ الزام نہیں دیتے۔ مگر عالم ہوش میں کوئی شخص اس قسم کی باتیں کرے تو اس پر ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ اندھا آدمی اپنی چیز کے بجائے کسی دوسرے کی چیز اٹھالے تو ہم اس پر چوری کا حکم نہیں لگاتے۔ مگر آنکھوں والا یہی حرکت کرے تو اسے فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دباؤ کے تحت نیکی کرے تو اس کی تعریف نہیں کی جاتی۔ مگر بغیر کسی دباؤ کے نیک عمل کرنے والے کی سب تعریف کرتے ہیں بچہ اگر گناہ نہیں کرتا تو اس کو نیک نہیں کہا جاتا۔ البتہ جوان آدمی کے عمل صالح پر نیکی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اولی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بعض افعال میں مختار ہے اور بعض افعال میں مجبور۔ اور پھر وجدانی طور پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ذمہ داری و جواب دہی اور اس کی بنیاد پر مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق کلیۃً اختیاری افعال پر مترتب ہوتا ہے، نہ کہ اضطراری افعال پر۔

مسئلۂ جبر و قدر کا نقطۂ آغاز لیکن جب انسان غور و فکر کر کے ظواہر اشیاء کی تہ میں پوشیدہ حقائق کا پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر منکشف ہوتا ہے کہ ظاہر میں وہ اپنے آپ کو جتنا قادر و مختار سمجھتا ہے اتنا نہیں ہے، اور سطحی نظر سے اس نے اپنی مجبوری اور اپنے اضطرار کے لئے جو حدود مقرر کی ہیں، وہ غائر نظر میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی نقطہ ہے جہاں سے مسئلۂ جبر و قدر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی بنیاد جن سوالات پر ہے وہ یہ ہیں :-

آیا انسان اپنے اعمال میں بالکل مجبور ہے یا کسی حد تک اس کو آزادی بھی حاصل ہے؟ انسان کو مجبور کرنے والی یا اس کی آزادی کو پابند کرنے والی طاقت کونسی ہے اور اس کے اثرات انسان کی زندگی میں کس حد تک ہیں؟

اگر انسان پابند یا مجبور ہے تو اعمال کی ذمہ واری و جوابدہی اور ان پر مدح وذم یا جزا و سزا کے استحقاق کا قاعدہ، جس پر ہمارے اخلاقی تصورات مبنی ہیں اور جو ہمارے نظام اجتماعی کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے، کس اساس پر قائم ہوگا؟

دنیا کے ارباب فکر نے ان سوالات پر مختلف نقطہائے نظر سے نگاہ ڈالی ہے، ان کے حل کے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ اور مختلف دلائل وشواہد کی بنا پر مختلف نظریے قائم کر لئے ہیں۔ اس باب میں اہل علم وتحقیق کے مقالات اور ان کے اختلافات اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ مشکل ہے لیکن اصولی حیثیت سے ہم ان سب کو چار قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ وہ جنہوں نے مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔

۲۔ وہ جنہوں نے طبیعی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

۳۔ وہ جنہوں نے اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا ہے۔

۴۔ وہ جنہوں نے دینی نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالی ہے؟

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ان مختلف نقاط سے مختلف گروہوں نے کس طرح اس مسئلہ پر غور کیا ہے، بحث واستدلال کی کون کونسی راہیں اختیار کی ہیں، اور آخر میں کن نتائج پر پہنچے ہیں۔

مابعد الطبیعی نقطۂ نظر مابعد الطبیعیات میں جبر وقدر کا مسئلہ دو وجوہ سے آتا ہے۔

وجہ اول۔ قدرت سے مراد ہم یہ لیتے ہیں کہ فاعل ایک ایسی ہستی ہو جس سے فعل کا صدور اور لاصدور دونوں صحیح ہوں۔ یا ایک دوسری تعبیر کے مطابق وہ اگر چاہے تو فعل کرے اور نہ چاہے تو

نہ کرے۔ قدرت کی یہ تعریف مان لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترک فعل پر فعل کی ترجیح، یا اس قدرت کا قوت سے فعل میں آنا کسی سبب سے ہوتا ہے یا بلا سبب؟ اگر بلا سبب ہو تو ترجیح بلا مرجح اور مسبب بلا سبب کا قول لازم آتا ہے جو خلاف عقل ہے۔ اور اگر اس کے لئے کسی مرجح یا سبب کا ہونا ضروری ہو۔ تو وہ کون ہے؟ جبریہ کہتے ہیں کہ وہ مرجح ایسے اسباب و دواعیات ہیں جن کا رشتہ انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے بس میں ہے جسے چاہو۔ خدا کہہ لو، چاہو علت العلل اور مسبب الاسباب یا قانون فطرت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرو اور قدریہ کہتے ہیں کہ وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔ جبریت کے قول سے یہ لازم آتا ہے کہ خیر اور شر دونوں کا مرجع خدا کی ذات ہو۔ کائنات میں انسان کی حیثیت محض جمادات و نباتات کی سی ہو، اور انسان کی ذمہ داری بالکل ساقط ہو جائے۔ قدریت کے قول سے لازم آتا ہے کہ انسان کا ارادہ خدا کے دائرۂ خلق و ابداع سے خارج ہو اور کائنات میں خدا کے سوا ایک چیز ایسی بھی ثابت ہو جو غیر مخلوق ہے، کیونکہ اگر انسان کے ارادہ کا خالق خدا نہیں ہے تو خود انسان بھی نہیں ہے، اس لئے کہ انسان خود مخلوق خدا ہے۔ لہٰذا انسان مخلوق کے ارادہ کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے جو ایک نہایت شنیع بات ہے۔

وجہ دوم۔ دلائل عقلیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ صانع کائنات کا علیم اور مُرید ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر صانع کو اس چیز کا علم نہ ہو جس کو وہ بنانے والا ہے، اور وہ اس کے بنانے کا ارادہ نہ کرے، تو وہ صانع ہی نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی بنا پر یہ لازم ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سب کا خدا کو پہلے سے علم تھا۔ اور اس کے پیش آنے کا خدا نے ارادہ کیا تھا۔ اب اگر خدا کو یہ علم تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت فلاں فعل کرے گا تو اس فعل کا اس وقت اس شخص سے واقع ہونا واجب ہے، کیونکہ اگر وہ واقع نہ ہو تو خدا کا علم جہل ہوگا، اور یہ محال ہے۔ اسی طرح اگر خدا نے یہ ارادہ کیا تھا، کہ فلاں وقت فلاں شخص سے فلاں حرکت سرزد ہو تو اس ارادہ کا پورا ہونا واجب ہے ورنہ ارادۂ آلٰہی کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ اس استدلال سے جبریہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فعل اختیاری بجز واجب الوجود کے کسی اور میں متحقق نہیں ہے۔ باقی جتنے مختار ہیں

سب کے سب مضطر بصورت مختار ہیں۔

قدریہ کا اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اس سے خدا کا فاعل خیر و شر ہونا لازم آتا ہے انسان کی تمام برائیوں کی ذمہ داری خدا کی طرف راجع ہوتی ہے اور اس اعتبار سے انسان حیوان جماد اور نبات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا لیکن جتنا یہ اعتراض وزنی ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ وہ اشکال وزنی ہے جو جبریہ نے علم آلہی اور ارادۂ آلہی کے بارے میں پیش کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ انسان کے اختیار کو نباہنا اور اس وجوب و لزوم سے جو خدا کے علیم و مرید ہونے کا منطقی نتیجہ ہے، انسان کی آزادی کو بچالے جانا نہایت مشکل ہے۔ قدریہ نے اس اشکال سے بچنے کے لئے جو راہیں اختیار کی ہیں ان میں سے اکثر اس سے زیادہ شنیع الزامات کو مستلزم ہیں جو وہ جبریہ پر عائد کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض نے خدا کے علیم و مرید ہونے ہی سے انکار کر دیا ہے بعض نے علم و ارادۂ الٰہی کو تسلیم تو کیا ہے، مگر وہ اس کو جزئیات و تفصیلات سے متعلق نہیں کرتے بلکہ اجمال پر محمول کرتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ خدا نے جو قوتیں انسان کو عطا کیں ان سے وہ صرف خیر کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور اسے یہ علم نہ تھا کہ ان کا غلط استعمال کیا جائے گا لیکن یہ ایسی ضعیف باتیں ہیں جن کے ابطال کے لئے کچھ زیادہ نظر و تامل کی ضرورت نہیں ہے۔

زیادہ سے زیادہ قوی دلیل جو جبریہ کے جواب میں قدریہ کی طرف سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے علم سابق اور انسان کی آزادی میں بظاہر خواہ کتنی ہی منافات نظر آتی ہو، لیکن حقیقت میں مستقبل کے کسی واقعہ کے متعلق کسی کے علم کی صحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علم ہی اس واقعہ کی علت ہو۔ اگر ہم موسم کے متعلق کوئی حکم لگائیں کہ فلاں وقت بارش ہوگی اور یہ حکم صحیح نکلے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بارش کے متعلق ہمارا علم ہی بارش کی علت ہے مگر یہ دلیل جتنی قوی نظر آتی ہے درحقیقت اتنی قوی نہیں ہے۔ اس لئے کہ حقیقی علم سابق اور ظن و قیاس دو الگ الگ چیزیں ہیں ظن و قیاس میں

کی صحت کو مظنون کے وقوع میں بلاشبہ کوئی دخل نہیں ہے، لیکن حقیقی علم سابق اور اس کے معلوم کے درمیان وجوب و لزوم کے تعلق کی نفی کرنا بہت مشکل ہے۔

ان اصولی اشکالات کے علاوہ متعدد فروعی اشکالات اور بھی ہیں جو مابعد الطبیعیات میں جبریت اور قدریت دونوں کو پیش آتے ہیں لیکن دونوں کی مشکلات یکساں نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جبریت نے انسان سے ارادہ کی آزادی سلب کر کے اس شئے کی نفی کی ہے جس کا ثبوت ہم اپنے نفس میں اوّلی و وجدانی طور پر پاتے ہیں۔ مگر قدریت نے جو مذہب اختیار کیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو خدا سے علم، ارادہ اور قدرت جیسی صفات کمالیہ کو سلب کر کے انسان کو ان سے متصف کرتی ہے یا سرے سے خدا یا علت العلل یا صانع کائنات کے وجود ہی کا انکار کرتی ہے، اور دونوں صورتوں میں بہت سے محالات لازم آتے ہیں جن کا ارتکاب فلسفہ و منطق کے قانون میں اوّلیات و وجدانیات کے انکار سے بہت زیادہ شنیع بلکہ اشنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد الطبیعیات کے حدود میں قدریت کو قدم جمانے کے لئے کوئی مضبوط بنیاد نہیں مل سکی ہے، اور دہریوں کی ایک قلیل جماعت کو چھوڑ کر، فلاسفہ کی عظیم اکثریت نے جبر کا پہلو اختیار کیا ہے۔ قدماء میں انکسیماندر (Anzximander) افلاطون اور اکثر رواقیہ (Stoics) مذہب جبر کے حامی تھے۔ فلاسفۂ اسلام کی عظیم اکثریت نے بھی اس مذہب کی حمایت کی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی ابن سینا اپنی تعلیقات شفا میں لکھتا ہے۔

"عرف عام میں مختار وہ ہے جو بالقوت ہو۔ بالقوت مختار ہمیشہ ایک ایسے مرجح کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے اختیار کو قوت سے فعل میں لائے عام اس سے کہ وہ خود اس کی اپنی ذات میں ہو یا اس سے خارج اس بنا پر ہم میں جو مختار ہے وہ در اصل مضطر کے حکم میں ہے"۔

یہی حال حکمائے افرنگ کا بھی ہے۔ پومپونیزی (Pomponazzi) صریح حکم

لگتا ہے کہ خدا فاعل خیر و شر ہے اور عقل کلیتہً جبر کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہابز (Hobbes) کہتا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور طبیعی داعیات کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ ڈیکارٹ (Descartes) جو نفس اور جسم یا روح و مادہ کی ثنویت کا قائل ہے مادی دنیا میں قانون جبر کے سوا کوئی قانون نہیں دیکھتا اس کے نزدیک انسان سمیت تمام عالم ایک مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ . . . .

اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ نفس میں کامل خود اختیاری کی قوت کا اثبات بھی کرتا ہے مگر اس کے مذہب کا منطقی نتیجہ جبر ہی ہے چنانچہ مذہب کارٹیزی (Cartesian School) کے دوسرے ائمہ جن میں میلبرانش (Malc branche) سب سے زیادہ نمایاں ہے، صاف کہتے ہیں کہ نفس کے ہر ارادہ کے ساتھ خدا جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اور جسم کے ہر تہیج کے ساتھ نفس میں ادراک خلق کرتا ہے۔ مادہ و روح یا امتداد و فکر کے درمیان خدا کا توسط لازمی ہے کیونکہ ایک واسطہ کے بغیر ان دونوں مستقل جوہروں میں تعامل متصور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خدا ہی تمام ارادات و حرکات کا حقیقی فاعل ہے۔ اسپائینوزا (Spinoza) کے نزدیک انسان اپنے اندر خواہ کتنی ہی فعلیت محسوس کرتا ہو مگر دراصل وہ فاعل نہیں بلکہ منفعل ہے، اس لئے وہ بالکل بے قدرت ہے۔ اس کے خیال میں یہی جبریت ایک فلسفی کے لئے مسرت و اطمینان قلب کا سرچشمہ ہے۔ لائبنیز (Leibniz) کے آحاد یا فردات (Monads) اگرچہ بجائے خود آزاد ہیں، مگر ان میں توافق ازلی (Pre-established harmoni) خدا کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے وہ بھی آخر کار جبر ہی کی طرف آجاتا ہے، بلکہ اس کی جبریت کو ہم جبریت خالصہ کہہ سکتے ہیں۔ لاک (Locke) آزادی ارادہ کو بے معنی اور اس قدریت کو جس کے آثار ڈیکارٹ کے فلسفہ میں پائے جاتے ہیں غلط قرار دیتا ہے۔ اگرچہ وہ صاف طور پر جبریت کا اقرار نہیں کرتا، مگر جب وہ یہ کہتا ہے کہ ہم ارادہ کرنے یا نہ کرنے کے لئے آزاد نہیں ہیں، اور یہ کہ ارادہ نفس سے معین ہوتا ہے، اور نفس

خواہش مسرت ہے، تو اس کے فلسفہ کا رخ قدریت سے جبریت کی طرف پھرجاتا ہے۔ شاپنہار (Schopenhauer) جس ارادہ کو انسان سے لیکر جمادات تک سب چیزوں میں کار فرما دیکھتا ہے وہ ہرگز وہ ارادہ نہیں ہے جس کی آزادی پر قدریت کی بنیاد قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانٹ (Kant) فشٹے (Fischte) اور ہیگل (Hegel) جیسے اکابر فلسفہ نے قدریت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے، سقراط نے آزادی ارادہ کی حمایت کی ہے، افلاطون نے انسان کے لئے اختیار ثابت کیا ہے، ارسطو نے اختیاری اور اضطراری افعال میں تمیز کر کے انسان کو ایک حد تک آزاد اور ایک حد تک مجبور قرار دیا ہے، خریسیفوس رواقی (Chrysippus) نے جبریت اور اخلاقی ذمہ داری میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اور فلاسفۂ اسلام میں سے ایک گروہ نے لاجبر و لاتفویض ولکن امرٌ بین الامرین کا مذہب اختیار کیا ہے، مگر یہ سب کچھ حکمت نظری کی خاطر نہیں بلکہ حکمت عملی کی خاطر ہے ورنہ جہاں تک خالص مابعد الطبیعی نقطۂ نظر کا تعلق ہے، اس کی رو سے جبریت کا پلڑا، قدریت کی بہ نسبت بہت زیادہ جھکا ہوا ہے، اور فلاسفہ کا اختلاف زیادہ تر جبریت اور قدریت کے اختلاف کی طرف نہیں بلکہ جبریت خالصہ اور جبریت متوسط کے اختلاف کی طرف راجع ہوتا ہے۔ (باقی)

نرخنامہ و قواعد اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـــہ ۱۰	ـليـــہ ۲۵	ـللعـــہ ۴۵	لـــہ ۸۰
نصف صفحہ	ـے ۶	ـعـــہ ۱۵	ـعيـــہ ۲۵	ـللعـــہ ۴۵
ربع صفحہ	للعہ	عـــہ ۱۰	ـعـــہ ۱۷	ـعيـــہ ۲۵

(۱) کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شایع نہ کیا جائے گا۔

(۲) اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

(۳) صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہئیت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

(۴) نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

(۵) ٹائیٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۲۵ فیصدی زیادہ ہوگی

قواعد

رسالۂ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینہ کی ۱۵ ؍ تاریخ کو شائع ہوا کریگا
مہینہ کی ۲۵ ؍ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہونچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں
ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی
ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب
رعایت کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور
دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے
جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر مضمون شایع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن

خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

باہتمام مولوی ابو محمد مصلح صاحب
اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن میں طبع ہوا